دارالعلوم دیوبند کا علمی دینی و اصلاحی

ماہنامہ دارالعلوم

نگرانِ اعلیٰ

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہ مہتمم دارالعلوم دیوبند

مدیر

ابن الانور سید محمد ازہر شاہ قیصر

مجید ۵۳

جلد ۶ شمارہ ۵

دار العلوم دیوبند کا دینی علمی ماہنامہ

دار العلوم

جمادی الاول ۱۳۷۳ھ مطابق فروری ۱۹۵۴ء

نگرانِ اعلیٰ

حضرت مولانا الحاج محمد طیب صاحب مدظلہ

(مدیر)

ابن الانور سید محمد ازہر شاہ قیصر

رسالہ ہر انگریزی مہینے کی پندرہ ۱۵ تاریخ کو شائع ہوگا

چندہ سالانہ

ہندوستان و پاکستان سے پانچ روپے ۵؍

ممالک غیر سے ۱۲ شلنگ۔ فی پرچہ ۸ آنے

طابع و ناشر

سید محمد ازہر شاہ قیصر مطبوعہ یونین پرنٹنگ پریس دہلی

مقام اشاعت دار العلوم دیوبند

فہرست مضامین

(۱) حرفِ آغاز　　سید محمد ازہر شاہ قیصر

(۲) کوائفِ دار العلوم دیوبند　　(ادارہ)

مقالات

(۳) فلسفۂ نعمت و مصیبت

حضرت مولانا محمد طیب صاحب مدظلہ

(۴) عہد نبوی صلعم میں قرآن مجید کی تدوین و ترتیب

مولانا محمد بدر الدین صاحب علوی

(۵) ایمان و کفر کا معیار

مولانا خالد محمود ایم، اے

(۶) اسلام میں حکومت کا درجہ

مولانا محمد اسحاق صاحب سندیلوی

(۷) تذکرہ ادبائے دار العلوم

مولانا محمد انوار الحسن انور شیرکوٹی

(۸) ایضاح الحق الصریح

مولانا محمد صاحب انوری لائل پوری

(۹) حضرت مولانا احمد حسن صاحب امروہی رح

مولانا نسیم احمد صاحب فریدی استاذ

مدرسہ عربیہ امروہہ

(۱۰) تنقید و تبصرہ

سید محمد ازہر شاہ قیصر و عزیز احمد فیض آبادی

پاکستان کے خریدار قدیم و جدید اپنا چندہ "مولانا محمد صاحب انوری مہتمم مدرسہ تعلیم الاسلام لائل پور" کو روانہ فرمائیں اور رسید ہمیں بھیجدیں۔ (ناظم)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ آغاز

(سید محمد از ہر شاہ قیصر)

ہمارے معاونین!

(۱) مولوی سلامت اللہ صاحب آزاد نے ایک خریدار کا چندہ بھیجا ہے۔

(۲) مولانا عزیز الرحمٰن صاحب نائب مہتمم مدرسہ تعلیم الاسلام لائل پور نے تین قدیم خریداروں کا چندہ عنایت فرمایا ہے۔

(۳) مولانا ابو سعید خدا بخش صاحب نے ملتان سے ایک خریدار عنایت فرمایا ہے۔

(۴) مولوی محمد ہاشم الحسینی صاحب نے مرغیا چک (ضلع مونگیر بہار) سے تین خریداروں کا چندہ بھیجا ہے۔

(۵) محترم کرم فرما مولوی قمر الدین صاحب نے جھریا ضلع مان بھوم سے تین خریدار بھیجے ہیں۔

(۶) مولانا محمد رمضان صاحب بھیروی نے مری (ضلع راولپنڈی) سے چار خریداروں کا چندہ عنایت فرمایا ہے۔

(۷) ہمارے قدیم کرم فرما جناب منظور احمد خاں صاحب نے کراچی سے دو خریداروں کا چندہ عنایت فرمایا ہے۔

(۸) مولانا عبد الرشید صاحب مولوی فاضل مدرس عربی ہائی اسکول جلال پور پیر والہ (ملتان) سے چار خریداروں کی پیشکش اور آئندہ رسالہ کی توسیع اشاعت کے لئے مزید توجہ فرمائی کا وعدہ کیا ہے۔ احقر مدیر مولانا کے اس برادرانہ تعاون کا قدر دان ہے۔

(۹) مولانا ابو سعید عبد العلیم صاحب قاسمی نے لاہور سے دو قدیم اور تین جدید خریداروں کی پیشکش فرمائی ہے۔

ادارہ موصوف کی دوستانہ توجہات کا دلی شکریہ ادا کرتا ہے حق تعالیٰ ان کی علمی اور عملی خدمات کو قبول فرمائیں۔

(۱۰) مولانا اخلاق حسین قاسمی نے دہلی سے اور مولانا احمد اللہ صاحب نے ہردوئی سے ایک ایک خریدار رسالہ کے لئے بھیجا ہے۔

(۱۱) رسالہ دار العلوم کے خاص محسن مولانا موسیٰ بھام جی نے جوہانسبرگ جنوبی افریقہ سے تین خریداروں کا چندہ عنایت فرمایا ہے۔ ادارہ مولانا کی توجہات کا خاص طور پر شکریہ ادا کرتا ہے۔

(۱۲) برادر محترم مولانا محمد سعید صاحب سملکی ممبر شوریٰ دار العلوم نے جنوبی افریقہ کے دو چندے رسالہ کے لئے عنایت فرمائے ہیں، احقر مدیر برادر موصوف کی اِن خاص توجہات کو رسالہ کے لئے بہت قیمتی سمجھتا ہے۔

(۱۳) جناب سعادت علی صاحب نے کان پور سے دو خریداروں کا چندہ بھیجا ہے۔

(۱۴) مولوی سید علی احمد نظیر (فاضل دیوبند) نے بمبئی سے ایک خریدار کی پیش کش کی ہے۔

(۱۵) مولوی صفی اللہ صاحب نے بڑھل گنج ضلع گورکھپور سے ایک خریدار عنایت فرمایا ہے۔

(بقیہ صد) کوائف دار العلوم کالم ۲ سے آگے:-

(۵) محمد اسمٰعیل صاحب دادا بھائی کھلوڑ ضلع سورت:- ۳۰۰ / ۱۱/

مندرجہ ذیل رقوم براہِ راست وصول ہوئیں:-

(۱) مسلم جنرل مرچنٹ ایسوسی ایشن ڈربن معرفت حاجی اسمٰعیل محموجی صاحب الس ۳۱۳

(۲) مولوی اسمٰعیل محمود صاحب پٹیل پری ہیلنگ جنوبی افریقہ - ۱۵ پاؤنڈ

کوائفِ دارالعلوم دیوبند

مجلس انتظامیہ کا جلسہ!

مجلس انتظامیہ کا سہ ماہی جلسہ بصدارت حضرت مولانا حکیم محمد اسحٰق صاحب، ۲۰؍ دسمبر ۱۹۵۳ء کو منعقد ہوا۔ جس میں حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب، مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی، خان بہادر شیخ محمد ضیاء الحق صاحب، حضرت مہتمم صاحب مدظلہ شریک ہوئے۔ حضرت مولانا مدنی مدظلہ گجرات کے سفر کی وجہ سے شرکت نہیں فرما سکے۔ اس جلسہ میں ذیل کی تجاویز پاس کی گئیں:۔

(۱) سب پاور ہاؤس کے سلسلہ میں زر ضمانت اور زر کی رقم مبلغ ۲۲۸۲ روپے ۶ روپیہ آنہ کو مجلس نے بامید منظوری مجلس شوریٰ منظور کیا۔ ساتھ ہی حافظ محمد ابراہیم صاحب وزیر شعبۂ متعلقہ کا شکریہ ادا کیا کہ انہوں نے دارالعلوم کی ضرورتوں کا خیال فرما کر سب پاور ہاؤس کی منظوری صادر فرمائی۔

(۲) شعبۂ ٹائپ کے متعلق رپورٹ پیش ہو کر قرار پایا کہ یہ شعبہ چونکہ اپنے نتائج امتحان سہ ماہی اور داخلہ کے لحاظ سے قابلِ اطمینان حالت پر چل رہا ہے اس لئے اس صیغہ کو باقی رکھا جائے لیکن مجلس کے نزدیک اس شعبہ کا تعلق بدستور شعبۂ صنائع سے رہنا چاہئے۔

(۳) مولوی نور الحسن معلم درجہ اُردو اور قرآن شریف کا استقلال ماہ محرم ۱۳۷۳ھ سے منظور کیا گیا۔

(۴) مولوی ناصر صاحب معلم درجہ مذکور کی درخواست رخصت منظور ہوئی اس شرط کے ساتھ کہ وہ رخصت کے یہ پندرہ دن گذار کر حاضر ہو جائیں اگر حاضر نہ ہوئے تو اسی دن سے یہ تعلق ملازمت ختم ہو جائے گا۔

امدادی عطیات!

آخیر نومبر ۱۹۵۳ء میں حضرت مہتمم صاحب مدظلہ نے مدراس اور حیدر آباد کا سفر فرمایا، اس سفر میں بعض احباب نے دارالعلوم کی امداد کے لئے چند رقوم حضرت موصوف کی خدمت میں پیش کیں جن کی تفصیل درج ذیل ہے:۔

(۱) مسلمانانِ [illegible] ضلع کشنا معرفت سیٹھ عبدالعلیم صاحب:۔ [illegible]

(۲) جناب حاجی محمد سلیمان و محبوب خاں صاحب [illegible]:۔ [illegible]

(۳) محمد رضا صاحب مینن روڈ بمبئی:۔ [illegible]

(۴) شیخ میران صاحب وجیواڑہ:۔ [illegible]

حیدر آباد میں افسر الاطباء جناب حکیم مقصود علی خاں صاحب نے جامعہ نظامیہ کے معائنہ کی دعوت دی۔ ۲۴ ربیع الاول ۱۳۷۳ھ کو حضرت مہتمم صاحب مدظلہ نے جامعہ کا معائنہ اور وہاں کے طلبہ کے سامنے تقریر فرمائی، جامعہ نظامیہ نے اپنی پچاس مطبوعات کے نسخے دارالعلوم کے لئے پیش کئے۔

شیخ الاسلام حضرت مولانا مدنی مدظلہ العالی نے دسمبر میں صوبہ گجرات کا طویل دورہ فرمایا تھا اس موقعہ پر مندرجہ ذیل [illegible] دارالعلوم کی امداد کے لئے حضرت موصوف کی خدمت میں پیش کی گئیں:۔

(۱) مسلمانانِ نواپور کی طرف سے۔ ایک ہزار ایک سو گیارہ [illegible]

(۲) مسلمانانِ لاجپور ضلع سورت کی طرف سے۔ [illegible]

(۳) مسلمانانِ کنتھاریہ ضلع بھڑوچ کی طرف سے۔ [illegible]

(۴) جناب اسمٰعیل بن حاجی سلیمان صاحب موضع کاپودرا بھڑوچ [illegible]

[illegible]

قسط ۱۶

مقالات

فلسفۂ نعمت و مصیبت

(از حضرت مولانا محمد طیب صاحب مدظلہ)

اور اگر یہ بے اعتدالیاں کریگا اور لا اعتدالی کی عدمی حرکات سے اس کائنات میں تصرفات کرے گا، مبالغوں سے اُس کے خزانے خرچ کرے گا اور وہ بھی خلاف رضاءِ حق، گویا عدم الاعتدال اور عدم القسط کا اُبھار اس سے ہوگا تو اُسی وحدۃ عدم سے کائنات کا بھی عدمی حصہ اُبھرے گا اور اُس کے عوارض بھی غیر معتدل ہی رنگ میں نمایاں ہوں گے اور اس قسم کے غیر معتدل اور بے جا تصرفات سے وہ طوفان اُبھریں گے کہ کائنات کا ذرہ ذرہ تباہ ہو جائے گا۔ جیسے ایٹم بم بنانے میں مثلاً انسانی بے اعتدالی، مبالغہ آمیزی اور مُفرطانہ تصرفات کا ظہور ہوا اور مثلاً کروڑ ہا روپیہ اُس کو بنانے اور تجربہ کرنے میں صرف کیا گیا اور دُنیا کی تمام معدنیات سے مدد لی گئی، لوہے، لکڑی کے کارخانے اُس کو بنانے میں مصروف ہوئے، چیدہ دماغ اس میں کھپے، گویا اُس کے بروئے کار لانے میں کائنات کے ایک بڑے حصے کو نچوڑ لیا گیا تو گویا انسان کے اس عدمی اور غیر معتدل تصرف نے کائنات کے سینکڑوں عدمی آثار اس ایٹم بم میں جمع کر دئے۔ اب جبکہ انسان کا دوسرا فعل ابراز خاصیات کا حرکت میں آئے گا اور اس بم کو پھٹنے اور اپنی خاصیات دکھلانے کا موقعہ دیا جائے گا تو قُدرتی طور پر اُس میں سے وہ چھپے ہوئے سلبی آثار کھُل پڑینگے اور اُن سے میل ہا میل کی زمین، اُس کے بسنے والے جانور، انسان، درخت اور پھل پھُول وغیرہ سب ہی عدم کی راہ ہو لیں گے، اور اُس کی تباہی بالآخر انسان ہی کی تباہی ہوگی۔

اِسی حقیقت کو حدیث نبویؐ میں اس طرح ظاہر فرمایا گیا ہے کہ:۔

ابو الدرداء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ:۔

سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول من سلك طریقاً یطلب فیہ علماً سلك اللہ بہ طریقاً من طرق الجنۃ وان الملٰئکۃ لتضع اجنحتھا رضاءً لطالب العلم وان العالم یستغفر لہ من فی السمٰوٰت ومن فی الارض والحیتان فی جوف الماء الخ رواہ احمد والترمذی وابوداؤد وابن ماجہ والدارمی (مشکوٰۃ ص کتاب العلم)

"میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا فرماتے تھے کہ جو شخص علم حاصل کرنے کیلئے کوئی راستہ اختیار کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اُسے جنّت کے راستوں میں سے ایک راستہ چلائیں گے، اور آپ نے فرمایا کہ طالب علم (دین) کی خوشنودی کے لئے فرشتے اپنے پَر بچھاتے ہیں اور آپ نے فرمایا کہ عالم کے لئے زمین اور آسمان کی تمام چیزیں مغفرت کرتی ہیں۔ یہاں تک کہ مچھلیاں پانی کے تہ میں۔"

(رواہ احمد والترمذی وابوداؤد و ابن ماجہ والدارمی)
(مشکوٰۃ ص کتاب العلم)

اِس حدیث میں انسانی علم و عدل کے اثرات کی وسعت واضح فرمائی گئی ہے کہ وہ عالمِ دُنیا سے عالمِ آخرۃ یعنی جنت تک پھیلی ہوئی ہے اُس کے وجودی کمالاتِ علم و عدل سے ملائکہ بھی متاثر ہوتے ہیں۔ زمین و آسمان کا ذرہ ذرہ متأثر ہوتا ہے۔ دریا کی مچھلیاں بھی متاثر ہوتی ہیں اور اُن میں انبساط ظاہر ہوتا ہے اور رضاء و خوشنودی کے وجودی آثار پھیلتے ہیں۔ اِس سے صاف ظاہر ہے کہ علم و عدل کی طرح عدم علم اور عدم عدل یعنی انسان کی جاہلانہ اور ظالمانہ حرکات سے بھی کائنات کا ذرہ ذرہ متاثر ہوگا اور اُس سے انقباض و لعن اور دُوری کے اثرات کھُلیں گے ملاءِ اعلیٰ میں بھی غضب و غصہ نمایاں ہوگا اور ملاءِ سافل میں بھی۔ اور یہ تاثیر و تأثر اور آثار کی آمد و رفت بغیر کسی وحدانی رشتہ کے ظہور پذیر

ہونا ناممکن ہے۔ سو وہی رشتہ وجود و عدم کلی ہے جو سب میں واحد ہے اور ذریعۂ ایصال و وصول ہے یا جیسے زمانۂ قرب قیامت میں نزول عیسوی کے وقت عدل عیسوی سے عالم کی خیر و برکت کا یہ عالم ہوگا کہ انگور کا ایک خوشہ اتنا پھلے گا کہ گھر بھر کے لئے کافی ہو جائیگا اور ایک بکری اس کثرت سے دودھ دیگی کہ ایک قبیلہ کے لئے کافی ہوگا، اور امن و سکون کا یہ عالم ہوگا کہ بھیڑ اور بھیڑیا ایک گھاٹ پانی پئیں گے، اور انسانوں کے بچے سانپوں سے کھیلیں گے نہ انھیں سانپ سے ڈر ہے گا نہ سانپ کو انسان سے خوف رہے گا۔ ہر نوع دوسری نوع سے امن میں ہوگی۔ تاریخ الخلفاء میں ہے، کہ خلفاء عباسیہ کے خزانہ میں مامون رشید کے زمانۂ عدل و انصاف کا ایک دانۂ گندم دیکھا گیا جو کھجور کی گٹھلی کی برابر تھا۔

پس انسانی صلاح اور اس کے علم و عدل کے وجودی کارنامے جمادات، نباتات، حیوانات۔ اور خلاصہ یہ کہ عالم کے ذرہ ذرہ میں امن و برکت کے آثار پیدا کر دیں گے گویا اس مرکزِ وجود کی وجودی حرکت سے پورے عالم کے وجود میں وجودی حرکت ہو کر کمالاتِ وجود حرکت میں آجائیں گے۔

غرض وجود کی یکتائی سے وجودی آثار اور عدم کی یکتائی سے عدمی آثار انسانی مرکز سے تمام اجزاء کائنات تک اور کائنات سے انسان تک آتے اور جاتے ہیں اور اس طرح یہ انسان بلحاظ وجود و عدم کائنات کے حق میں بمنزلہ تخم کے ثابت ہوتا ہے کہ انسانی تصرفات سے ہر چیز میں سے جو بھی خلقی جوہر برآمد ہوتے ہیں وہ درحقیقت انسان ہی کے مکنون اجمالات کی تفصیل ہوتے ہیں۔ گویا انسان ساری کائنات کا خلاصہ ہے کہ اس کے افعال سے جو کچھ اس کے باہر ہوتا ہے اس کی میزان اندر لگتی ہے اور یہ جوش عقل و طبع اور عشق شرع و مذہب سے جیسی بھی حرکت کرتا ہے وجودی ہو یا سلبی یعنی اعتدال کی ہے یا عدم اعتدال کی وہ وجود و عدم کے اشتراک سے اور خود انسان کے مرکزی نقطۂ وجود و عدم ہونے سے تمام اجزاء عالم میں درجہ بدرجہ اپنے اثرات پھیلائے بغیر نہیں رہتی اور پھر وہ اثرات بطور صدائے بازگشت خود اسی کی طرف لوٹے بغیر بھی نہیں رہ سکتے۔ کہ وجود کو وجود

سے اور عدم سے عدم ہی کو مناسبت ہو سکتی ہے۔

اس حقیقت کو مزید نمایاں کرنے کے لئے، اپنے اندر یوں سمجھیے کہ جیسے انسانی بدن میں ہاتھ پاؤں وغیرہ اعضاء متعدد ہیں مگر وجود سب کا ایک ہی ہے اور ایک ہی نفس سب میں مؤثر ہے کہ یہ سب ایک ہی نفس کے اعضاء و اجزاء ہیں۔ اسی لئے ہاتھ کے درد سے پیر کو اور پیر کی تکلیف سے دوسرے تمام اعضاء کو دکھ درد محسوس ہوتا ہے۔ ہاں مگر باوجود وحدۃ وجود اور توحید نفس کے انسان میں وجود کا وہ مرکزی نقطہ جو اولیت کے ساتھ وجود کا مستقر ہے کہ تمام وجودی حرکتیں اول اس میں پیدا ہوتی ہیں اور پھر دوسرے اعضاء تک منتقل ہوتی ہیں۔ قلب ہے، کیوں کہ وہ تمام حقائق بدن کا جامع اور علم و اخلاق کا مرکز ہے۔ اعضاء کی زندگی، حرکت و سکون، علم و عمل سب کے نمونے اور مادے قلب ہی میں ہیں اور اسی لئے اس کی خوبی اور خرابی پر سارے تن من کی خوبی و خرابی کا دارومدار ہے۔

اور وہ خوبی و خرابی درحقیقت قلب ہی کی ہوتی ہے جو اعضاء سے لوٹ کر اسی کی طرف پہونچتی ہے۔ چنانچہ قلب کی ہر علمی و عملی حرکت قالب کے گوشہ گوشہ میں پھیل کر ہر عضو میں اس کے مناسب حال عمل کو حرکت پیدا کر دیتی ہے اور اعضاء کے اچھے برے عمل کے آثار بالآخر لوٹ کر پھر قلب ہی کی طرف رجوع کرتے ہیں کہ یا وہ دکھ درد محسوس کرتا ہے یا فرح و سرور۔ پس کائنات بدن کا صلاح و فساد قلب کے صلاح و فساد پر موقوف ہے۔

ونی الجسد مضغۃ اذا	"بدن میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے اگر
صلحت صلح الجسد کلہ	وہ ٹھیک ہے تو تمام بدن ٹھیک ہے،
واذا فسدت فسد الجسد	اور اگر وہ خراب ہے تو تمام بدن خراب ہے
کلہ الا وھی القلب۔	اور وہ قلب ہے۔"

بعینہ اسی طرح انسان اپنی ثابت شدہ جامعیت کی بناء پر کائنات کا قلب ہے۔ کہ اس کے صلاح و فساد پر عالم کا صلاح و فساد موقوف ہے پس اگر یہ وجودی افعال یعنی عدل و علم کے افعال سے کائنات میں تصرفات کرتا ہے تو وجود کے اشتراک سے کائنات کے وجودی آثار کھل کر پوری کائنات پر چھا جاتے ہیں اور پھر نعمتوں کی صورت میں

لوٹ کر انسان ہی کی طرف آتے ہیں۔ اور اگر وہ عدمی افعال یعنی عدم علم اور عدم عدل کے ماتحت جاہلانہ اور ظالمانہ حرکات سے کائنات میں تصرف کرتا ہے تو اُسی وجود کے اشتراک سے کائنات کی عدمی خاصیات کُھلیں گی جو آفات بن کر عالم پر چھا جائیں گی اور پھر مصائب کی صورت میں لوٹ کر انسان ہی کی طرف عود کرینگی۔ غرض اُس کے وجودی افعال سے کائنات میں صلاح نمایاں ہوگی اور اُس کے عدمی حرکات سے فساد کا ظہور ہوگا۔ اور وجود کے اشتراک سے ہر نوع میں درجہ بدرجہ رونما ہوگا۔ قرآن عزیز نے اسی کی طرف اشارہ فرمایا۔

ظهر الفساد فی البر والبحر	"انسانی اعمال کی بدولت تمام خشکی
بما کسبت ایدی الناس	اور تری میں فساد پھیل گیا تاکہ اُن کے
لیذیقهم بعض الذی	اعمال کا کچھ حصہ اُنھیں چکھائے
عملوا لعلهم یرجعون۔	اُمید ہے کہ وہ رجوع کرلیں"

البتہ ہر چیز کا فساد اُس کی نوعیت کے مناسب ہی اُس سے نمایاں ہوگا جس کو ہمنے ابھی افراط اور عدم الاعتدال سے تعبیر کرکے چند مثالوں سے عرض کیا۔ مثلاً زمین کا فساد بنجر ہو جانا ہے کہ اُگانے کی صلاحیت نہ رہے، بادلوں کا فساد امساک ہے یعنی بارش نہ ہونا۔ ہوا کا فساد سمیت ہے یعنی امراض پھیلانا۔ پہاڑوں کا فساد عدم ثبات ہے یعنی شق ہو جانا اور گر پڑنا۔ دریاؤں کا فساد اُن کی بے اعتدال حرکت ہے یعنی طوفان یا بندش وغیرہ۔ جن میں انسانی تصرفات بے جا محرک ہو جاتے ہیں اور اس لئے یہ فسادات بالآخر انسان ہی کے حق میں لوٹ کر تباہ کن ثابت ہوتے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ ساری خرابیاں بظاہر اسباب طبعیہ کے ماتحت رونما ہوتی ہیں انھیں انسان کی ظالمانہ حرکات سے کیا تعلق؟ تو سوال یہ ہے کہ خود اسباب طبعیہ آخر کس چیز کے ماتحت حرکت کرتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ طبیعت وجود پاکر ہی حرکت کر سکتی ہے نہ کہ معدوم رہکر۔ کیوں کہ عدم میں تو نہ خود متحرک ہونے کی صلاحیت ہے نہ دوسرے کو حرکت دینے کی اور جہاں اُس کیلئے حرکت کا لفظ استعمال کیا گیا ہے وہ محض سمجھانے کے لئے اور جب طبیعت کی حرکت کے لئے وجود ضروری ہے تو حقیقتاً محرک پھر وہی وجود نکلا۔ اور وجود سب کا ایک ہے اور اُس میں مرکزی نقطۂ وجود انسان ہے۔

جو سارے وجودات کا جامع ہے اور اُن کی حرکتوں کا گویا سِرا ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ غیر محسوس طریق پر انسان کے افعال کو کائنات کی حرکت میں دخل نہو جیسا کہ خود کائنات کے طبعی افعال خواص و آثار کو انسان میں دخل ہے کہ انہی اجزاء و احوال کائنات سے اُس کے مزاج صحت اور طبیعت میں فرق پڑ جاتا ہے۔ ہاں جیسے طبیعت اور اُس کا وجود غیر محسوس ہے ایسے ہی انسانوں کی حرکات اور اجزاء کائنات کی تاثیر و تاثر کا رشتہ بھی غیر محسوس ہے مگر غیر معقول نہیں غرض عقلی طور پر اتنا واضح ہو جاتا ہے کہ کائنات میں انسان وجود کا مرکزی نقطہ ہے اُس سے جو حرکت بھی سرزد ہوتی ہے اُس کا اثر غیر شعوری طور پر کائنات میں پہونچنا ضروری ہے، اور اُس سے لوٹ کر پھر مرکز تک آنا بھی ضروری ہے۔ پس جیسے مرکز بحر سے اُٹھی ہوئی لہریں کناروں سے جا کر ٹکراتی ہیں اور ٹکر کھا کر پھر آخر کار مرکز ہی کی طرف لوٹتی ہیں۔۔ یا جیسے جڑ کی خوبی و خرابی شاخوں کی رگ رگ میں پھیل جاتی ہے اور پھر شاخوں کی بھلائی بُرائی یعنی شادابی اور خشکی لوٹ کر اپنی ہی جڑ کی طرف آتی ہے اور اُسے مضبوط، یا کھوکلا بنا دیتی ہے۔ غرض اصل کی خوبی و خرابی کا فروع تک پہنچنا، اور فروع سے لوٹ کر پھر جڑ تک آنا کوئی غیر طبعی فعل نہیں جس کے ماننے میں پس و پیش کیا جا سکے۔ اسی طرح وجود کے اس مرکزی حصہ انسان کی حرکت پوری وجودی کائنات تک ہوگی اور پھر اُس سے لوٹ کر خود انسان تک پہونچ جانی ضروری ہوگی۔ اس لئے یہ ثابت ہو گیا کہ انسانی اعمال اور کائنات کے ثمراتی اثرات میں مابہ الربط یہ طبعی وجود ہے جو ساری کائنات میں یکسانی اور یکتائی کے ساتھ پھیلا ہوا ہے اور وہی اعمال کے اثرات کائنات تک اور کائنات کی خاصیات نفسِ انسانی تک لاتا اور لے جاتا ہے۔ اور جبکہ یہ صالح و فاسد اثرات تکوینی ہیں قانونی نہیں ہیں کہ بطور سزا و تعزیر نمایاں ہوتے ہوں بلکہ بطور خاصیت اشیاء نمایاں ہوتے ہیں تو مابہ الربط بھی تکوینی اور طبعی ہی ہونا چاہئے تھا جو انسان کی قدرت سے بالاتر ہو سو وہ وجود کے سوا دوسری چیز نہیں کہ جیسے کائنات کے خواص و آثار انسان کے بس میں نہیں کہ اُن کے کھولدینے کی...

قسط ۳:-

عہدِ نبوی میں قرآن مجید کی تدوین و ترتیب

(مولانا محمد بدرالدین علوی اُستاذ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڈھ)

قرآن مجید کے جو نسخے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے املاء اور ترتیب پر تیار ہوئے تھے، وہ تحریر اور زبانی قرأت دونوں میں باہم مطابق تھے، اس لئے کہ دونوں کاموں میں خود رسول اللہؐ کا دستِ مبارک شامل تھا، اور زبانی قرأت میں اکثر تحریری نسخوں کے ساتھ مقابلہ ضروری تھا، بالخصوص ایسے مواقع پر جہاں تشابہ لگ جائے، ان میں اختلاف نہ ہونے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ وعدۂ الٰہی ہے:-

انا نحن نزلنا الذکر	"یعنی ہم ہی نے قرآن اُتارا، اور
وانا لہٗ لحٰفظون۔	ہم ہی اسکی حفاظت کے ذمہ دار ہیں"

اگر اختلاف ہوگیا تو پھر حفاظت کیا ہوئی۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ حضرات صحابۂ کرامؓ اس کی اہمیت سے پوری طرح واقف تھے، کہ قرآن مجید کے ہر معاملہ میں توافق اور تطابق ضروری ہے اور خود قرآن مجید نے اُن کو بتلایا تھا:-

لو کان من عند غیر اللہ	"یعنی اگر قرآن مجید غیر خدا کی جانب
لوجدوا فیہ اختلافاً	سے ہوتا، تو لوگ اس میں بہت
کثیراً ط	اختلاف پاتے؟

اس لئے جب خُدا کی جانب سے اختلاف غیر ممکن تھا تو پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ انسانوں کی جانب سے اس میں اختلاف پیدا کردیا جاتا۔

(۲) عہدِ نبویؐ کی ترتیب اور موجودہ مصحف کی ترتیب میں مطابقت کی دوسری دلیل یہ ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رمضان میں قرآن مجید کا دور کیا کرتے تھے، اس دورے میں اُس وقت تک کی نازل شدہ وحی کی تکرار ترتیب کے ساتھ ہوا کرتی تھی۔ چنانچہ جس سال آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے رحلت فرمائی، اس سال قرآن مجید کا دور دو بار ہوا۔ دور اوّل کا واقعہ صحیح بخاری جلد سوم صفحہ ۱۴۱ میں مذکور ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ دورہ غیر مرتب صورت میں نہیں ہوسکتا اس کے لئے ترتیب آیات اور ترتیب سور ضروری ہے، جو بتوفیق الٰہی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے دی تھی، اسی ترتیب کے ساتھ آپ نے قرآن مجید اُمّت کو اشاعت کے لئے دیا اس لئے یہ ہرگز بھی خیال نہیں کیا جاسکتا کہ اس ترتیب میں جو بتوفیقِ الٰہی ہوچکی تھی کوئی تغیّر و تبدل کیا جاسکتا تھا، اس قسم کی روایتیں موجود ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ کوئی شخص بھی اس ترتیب میں تغیّر کی جُرأت نہیں کرسکتا تھا، مثلاً:-

(الف) تذکرۃ الحفاظ میں ہے:-

ان الحجاج خطب فقال	"یعنی حجاج نے خطبہ دیا اور کہا کہ ابن زبیرؓ
ان ابن الزبیر بدل	نے کلامِ خدا کو بدلدیا، اس پر ابن عمرؓ کھڑے
کلام اللہ فقام ابن عمر	ہوئے اور کہا کہ جھوٹ ہے، نہ ابن زبیرؓ
فقال کذب لم یکن	کو یہ طاقت تھی کہ وہ کلام اللہ کو
ابن الزبیر یستطیع	بدل سکتے اور نہ تجھکو یہ مقدور
ان یبدل کلام اللہ	ہے"
ولا انت (جلد اوّل ص۳۷)	(تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۳۷)

(ب) صحیح بخاری میں ہے:-

قال ابن الزبیر لعثمان	"یعنی ابن زبیرؓ نے حضرت عثمانؓ
ابن عفان والذین یتوفون	سے کہا کہ آیت والذین یتوفون
الخ قال قد نسختھا الآیۃ	منکم الخ ایک دوسری آیت سے منسوخ

الاخریٰ فلم تکتبها او تدعها۔ قال یا ابن اخی! لا اغیر شیئاً منه من مکانه۔

ہو چکی ہے تو آپ اُس آیت کو نہ لکھتے یا یہ کہا کہ اسکو چھوڑ دیتے، اس پر عثمانؓ نے کہا کہ اے میرے بھتیجے میں قرآن کی کسی چیز کو اسکی جگہ سے نہیں ہٹا سکتا۔"

(صحیح بخاری ج ۲ ص ۶۵۲)

الغرض جو قرآن اس وقت ہمارے ہاتھوں میں بذریعہ تواتر موجود ہے وہ یقیناً اسی ترتیب کے مطابق ہے، جس پر حضرت جبرئیلؑ کا دورہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سالانہ ہوا کرتا تھا

(۳) تیسری دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی تلاوت کو ہفتے پر اس طرح تقسیم کر دیا تھا کہ ہر روز کے لئے ایک مقدار معین فرمائی تھی، اس مقدار کا نام حزب ہے، حزب کی جو تفصیل حدیث میں آئی ہے، وہ اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ قرآن مجید کی ترتیب سور عہدِ نبویؐ میں بالکل وہی تھی جو آج ہے۔ اسکی شہادت کے لئے احادیث ذیل ملاحظہ ہوں:۔

(الف) عن اوس ابن حذیفة الثقفی قال کنت فی الوفد الذین اسلموا من ثقیف ـــ فقال لنا رسول الله صلی الله علیه وسلم طرأ علیّ حزبی من القرآن فاردت ان لا اخرج حتیٰ اقضیه فسألنا اصحاب رسول الله صلی الله تعالیٰ علیه وسلم وقلنا کیف تحزبون القرآن قالوا نحزبه ثلث سور وخمس سور وسبع سور وتسع سور واحدیٰ عشرة سورة وثلث عشرة سورة وحزب المفصل من ق حتی یختم۔

"یعنی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرا معمول قرآن مجید پڑھنے سے رہ گیا تھا، تو میں نے یہ ارادہ کیا کہ جب اس مقدار معین کو ادا کروں اُس وقت باہر نکلوں۔ ـــ اس بات پر ہم نے صحابہ سے پوچھا کہ آپ لوگوں نے قرآن کا حزب کس طریقے سے مقرر کیا ہے۔ انھوں نے جواب دیا کہ پہلا حزب تین سورتوں کا، دوسرا پانچ سورتوں کا، تیسرا نو سورتوں کا، چوتھا گیارہ سورتوں کا، پانچواں تیرہ سورتوں کا، اور چھٹا آخری مفصل کا جو سورۂ ق سے ختم قرآن تک ہے۔"

(مسند احمد بن حنبل جلد ۴ ص ۳۴۳)

اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو ترتیب سور اس وقت ہے وہی اُس وقت بھی تھی۔

(ب) عن واثلة ابن الاسقع قال رسول الله صلی الله علیه وسلم اعطیت مکان التوراة السبع الطوال واعطیت مکان الزبور المئین واعطیت مکان الانجیل السبع المثانی وفضلت بالمفصل۔

"یعنی مجھ کو توریت کے بدلہ میں قرآن کی سات بڑی سورتیں عطا ہوئی ہیں، اور زبور کے بدلہ میں سَو آیتوں والی سورتیں، اور انجیل کے بدلہ میں سورۂ فاتحہ اور مجھ کو مفصل سورتیں عطاء فرما کر فضیلت دی گئی ہے۔"

(مسند احمد بن حنبل جلد ۴ ص ۱۰۷)

عہدِ نبویؐ کی ترتیب سے موجودہ قرآن کی ترتیب کی مطابقت کی ایک بڑی دلیل یہ ہے کہ اکابر علمائے اسلام جو مختلف قوموں فرقوں اور زمانوں میں گزرے ہیں شروع سے آخر تک اس بات کے قائل رہے ہیں کہ قرآن مجید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں جمع ہو چکا تھا، اور اس کی آیتیں اور سورتیں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مرتب فرمائی تھیں، اور پھر اسی ترتیب کے ساتھ وہی مجموعہ بذریعہ تواتر مسلمانوں میں برابر چلا آرہا ہے، اُن میں سے بعض علماء کی رائیں پیش کی جاتی ہیں:۔

(۱) امام مالکؒ (متوفی ۱۷۹ھ) سے جو قدیم ترین علماء میں ہیں، اتقان میں منقول ہے:۔

عن ابی وهب سمعت مالکاً یقول انما الّف القرآن علیٰ ما کانوا سمعوا من النبی صلی الله علیه وسلم

(اتقان ص ۱۴۴)

"یعنی قرآن کی تالیف اسی طریقہ پر ہوئی ہے جس طریقے پر صحابہؓ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا۔"

(اتقان ص ۱۴۴)

(۲) امام بغوی (متوفی سنہ ۵۱۰ھ) کا یہ قول بھی اتقان میں ہے:۔

قال البغوی فی شرح السنة الصحابة جمعوا بين الدفتين القرآن الذی انزله الله علی رسوله فكتبوه كما سمعوه من رسول الله صلی الله عليه وسلم من غير ان قدموا شيئاً او اخروا او وضعوا له ترتيبا لم يأخذوه من رسول الله وكان رسول الله صلی الله عليه وسلم يلقن اصحابه ويعلمهم ما نزل عليه من القرآن علی الترتيب الذی هو الآن فی مصاحفنا بتوقيف جبريل اياه علی ذلك واعلامه عند نزول كل آية ان هذه الآية تكتب عقب آية كذا فی سورة كذا۔

"یعنی امام بغوی نے اپنی کتاب شرح السنۃ میں لکھا ہے کہ صحابہؓ نے دو پٹھوں کے اندر اسی قرآن کو لکھا جس کو اللہ نے اپنے رسول پر نازل فرمایا جیسا اُنھوں نے سُنا ویسا ہی لکھ لیا، نہ اس میں کسی چیز کو آگے رکھا اور نہ کسی چیز کو پیچھے کیا، اور نہ کوئی ایسی ترتیب دی کہ جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل نہ کیا ہو، کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کو قرآن اسی ترتیب پر تلقین کردیتے تھے جو اس وقت ہمارے نسخوں میں ہے، اور یہ اس طور پر تھا کہ جبرئیل بوقتِ نزول آپ کو بتلا دیتے تھے کہ یہ آیت فلاں آیت کے بعد فلاں سورت میں لکھی جائے۔"

(اتقان ص۱۴۴ و ص۱۴۵)

(۳) ابن الحصار فرماتے ہیں:۔

ترتيب السور ووضع الآيات مواضعها انما كان بالوحی وكان رسول الله يقول ضعوا آية كذا فی موضع كذا فقد حصل اليقين من النقل المتواتر بهذا الترتيب من تلاوة رسول الله صلی الله عليه وسلم ومما اجمع الصحابة علی وضعه

"یعنی ابن الحصار کہتے ہیں، کہ سورتوں کی ترتیب اور آیتوں کی جگہیں وحی کے ذریعے سے معلوم ہوئی ہیں، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ فلاں آیت فلاں جگہ پر لکھو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاوت اور صحابہؓ کے اجماع سے جو بنقل متواتر ہے، یہ بات بالکل یقینی ہے۔" (اتقان ص۱۴۵)

(۴) ابوبکر ابن الانباری (متوفی ۳۲۸ھ) کا بیان ہے:۔

انزل الله القرآن كله الی سماء الدنيا ثم فرقه فی بضع وعشرين سنة فكان السورة تنزل لامر يحدث والآية جوابا لمستخبر ويوقف جبريل النبی علی موضع الآية والسورة فاتساق السور كاتساق الآيات والحروف كله عن النبی صلی الله عليه وسلم فمن قدم سورة او اخرها فقد افسد نظم القرآن۔

"یعنی ابوبکر ابن الانباری کہتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ نے قرآن سارے کا سارا سماء دُنیا پر نازل فرمادیا، پھر بیس سال سے کچھ زیادہ میں اس کو بانٹ دیا، چنانچہ سورۃ کسی پیش آمدہ واقعہ کیلئے اور آیت سائل کے سوال کے جواب میں اُترتی تھی تو جبرئیلؑ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو آیت اور سورۃ کی جگہ بتلا دیتے تھے، اس لئے سورتوں کی ترتیب بھی مثل آیتوں کی ترتیب کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مرتب کردہ ہے اور اگر کوئی شخص کسی سورۃ کو مقدم یا مؤخر کریگا، تو وہ نظم قرآنی کو بگاڑ دیگا۔"

(اتقان ص۱۳۵، ص۱۳۶)

(۵) برہان الدین ابوالقاسم محمود بن حمزہ ابن نصر الکرمانی المقری الشافعی (صاحب کتاب البرہان فی توجیہ متشابہ القرآن) (متوفی بعد ۵۰۰ھ) کذا فی الکشف فرماتے ہیں:۔

ترتيب السور هكذا هو عند الله فی اللوح المحفوظ علی هذا الترتيب وعليه كان النبی يعرض علی جبريل كل سنة ما كان يجتمع عنده فيه وعرضه عليه فی السنة التی توفی فيها مرتين۔

(اتقان ص۱۳۶)

"یعنی کرمانی نے اپنی کتاب برہان میں لکھا ہے کہ سورتوں کی ترتیب اسی طرح اللہ تعالےٰ کے یہاں لوحِ محفوظ میں ہے اور اسی ترتیب کے مطابق آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم ہر سال جبرئیل سے جمع شدہ قرآن کا دورہ کرتے تھے، جو آپ پر اس وقت تک نازل ہوچکا ہوتا تھا، سالِ وفات میں دو بار حضرت جبرئیلؑ کے ساتھ دورہ ہوا۔"

(۶) طیبی (متوفی ۹۸۱ھ) فرماتے ہیں کہ:۔

قال الطیبی انزل القرآن اولاً جملة واحدة من اللوح المحفوظ الی السماء الدنیا ثم نزل علی حسب المصالح ثم اثبت فی المصاحف علی التالیف والنظم المثبت فی اللوح المحفوظ

"یعنی طیبی کہتے ہیں کہ قرآن پہلے مجموعی طور پر لوحِ محفوظ سے آسمانِ دُنیا پر نازل ہُوا، پھر ضرورت کے مطابق نازل ہوتا رہا، پھر اسی ترتیب کے مطابق جو لوحِ محفوظ میں ہے مصاحف میں لکھا گیا" (اتقان ص۱۷۶)

(۷) احمد ابن ابراہیم بن الزبیر الغرناطی (متوفی ۸۰۷ھ) فرماتے ہیں کہ:-

قال ابوجعفر ابن الزبیر الآثار تشهد لذلک کقوله اقرؤا الزهراوین والبقرة وآل عمران رواه مسلم ولحدیث سعید ابن خالد صلی رسول الله بالسبع الطوال فی رکعة رواه ابن ابی شیبة فی مصنفه وفیه انه کان یجمع المفصل فی رکعة وروی البخاری عن ابن مسعود انه قال فی بنی اسرائیل والکهف ومریم وطه والانبیاء انهن من العتاق الاول وهن من تلادی وذکرها نسقاً کما استقر ترتیبها وفی البخاری انه علیه السلام کان اذا اوی الی فراشه کل لیلة جمع

"یعنی ابوجعفر ابن زبیر کہتے ہیں کہ بہت سی حدیثیں ترتیب کی شہادت دیتی ہیں مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "دو چمکتی ہوئی سورتیں البقرہ اور آلِ عمران پڑھا کرو" اسکو مسلم نے روایت کیا، اسی طرح سعید ابن خالد کی یہ حدیث کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سات بڑی بڑی سورتیں ایک رکعت میں پڑھیں اس حدیث کو ابن ابی شیبہ نے اپنی مصنف میں روایت کیا ہے، اسی کتاب میں ایک اور بھی حدیث ہے کہ آنحضرت مفصل سورتوں کو ایک ہی رکعت میں پڑھ ڈالتے تھے۔ بخاری نے ابن مسعودؓ سے روایت کی ہے کہ سورۃ بنی اسرائیل اور کہف اور مریم اور طٰہٰ اور انبیاء یہ سب کی سب اعلیٰ درجے کی سورتیں ہیں، اور یہ میرا مال موروثی ہیں، اسطرح ان سورتوں کا ذکر اسی ترتیب سے فرمایا جس ترتیب کے ساتھ آج وہ ہیں۔ بخاری میں یہ بھی روایت ہے

کفیه ثم نفث فیهما یقراء قل هو الله احد والمعوذتین۔ (اتقان ص۱۷۶)

کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہر رات کو جب اپنے بستر پر تشریف لیجاتے تھے تو اپنی ہتھیلیوں کو ملا کر "قل ہو اللہ" اور "معوذتین" پڑھ کر پھونکتے تھے۔"

(۸) ابوجعفر النحاس (متوفی ۳۳۸ھ)۔ فرماتے ہیں:-

قال ابوجعفر النحاس المختار ان تالیف السور علی هذا الترتیب من رسول الله لحدیث واثلة اعطیت مکان التوراة السبع الطوال الحدیث قال فهذا الحدیث یدل علی ان تالیف القرآن ماخوذ عن النبی صلی الله علیه وسلم وانه من ذلک الوقت، وانما جمع فی المصحف علی شیء واحد لانه قد جاء هذا الحدیث بلفظ رسول الله صلی الله علیه وسلم علی تالیف القرآن قال ومما یدل علی ان ترتیبها توقیفی ما اخرجه احمد وابوداؤد عن اوس ابن اوس حذیفة الثقفی قال کنت فی الوفد الذین اسلموا من ثقیف الخ قال فهذا یدل علی ان ترتیب السور علی ما هو فی المصحف الآن کان علی عهد رسول الله قلت ومما یدل علی انه توقیفی

"یعنی ابوجعفر نحاس کہتے ہیں کہ صحیح بات یہی ہے کہ سورتوں کی یہی ترتیب رسول اللہ کی دی ہوئی ہے، جیسا کہ حدیث واثلہ سے معلوم ہوتا ہے (یہ حدیث پہلے ذکر کی جا چکی ہے)۔ یہ حدیث صاف بتلاتی ہے کہ قرآن کی ترتیب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے معلوم ہوئی تھی، اور وہ اسی وقت کی ہے، اور اِس وقت کا قرآن اُسی ترتیب پر ہے اس لئے کہ یہ حدیث ترتیب قرآن کے متعلق خود آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ہے۔ ابوجعفر یہ بھی کہتے ہیں کہ قرآن کی ترتیب توقیفی ہونے پر اوس ابن ابی اوس کی روایت بھی دلالت کرتی ہے (یہ روایت بھی اوپر گذر چکی ہے) علامہ سیوطی کہتے ہیں کہ میرے نزدیک سورتوں کی ترتیب توقیفی ہونے پر ایک دلیل یہ بھی ہے کہ حٰمٓ سے شروع ہونے والی سورتیں ترتیب لائی گئی ہیں، اور اسی طرح سے طٰس والی بھی لیکن سبّح یا یسبّح سے شروع ہونے والی سورتیں ترتیب وار نہیں ہیں۔ بلکہ اُن کے اندر فصل واقع ہے۔ اسی طرح طسمٓ، سورۂ شعراء و طسمٓ سورۂ

کون الحوامیم رتبت ولاءً وکذا الطواسین ولم یرتب مسبحات ولاء بل فصل بین سورہا وفصل بین طسم الشعراء وطسم القصص بطٰس مع انہا اقصر منہا ولو کان الترتیب اجتہادیا لذکرت المسبحات ولاءً واُخرت طس عن القصص

قصص کے بیچ میں طٰس ہے۔ حالانکہ وہ ان دونوں سے چھوٹی ہے، اس لئے اگر ترتیب اجتہادی ہوتی تو مسبحات ترتیب وار لائی جاتیں، اور طٰس سورۂ قصص سے پیچھے لائی جاتی۔"

بحوالہ اتقان
(ص ۱۴۷ و ص ۱۴۸)

(۹) ابن حزم (متوفی ۴۵۶ھ) کا بیان ہے:۔

والقول بان تقسیم آیات القرآن وترتیب مواضع سورہ شیٔ فعلہ الناس لیس ہو من امر رسول اللہ فقد کذب ہذا الجاہل وافک اتراہ ما سمع قول اللہ تعالیٰ ما ننسخ من آیۃ او ننسہا نات بخیر منہا او مثلہا وقول رسول اللہ فی آیۃ الکرسی وآیۃ الکلالۃ والخبر انہ کان یامر اذا نزلت الآیۃ ان تجعل فی سورۃ فی موضع کذا ولو ان الناس رتبوا سورۃ لما تعدوا احد وجوہ ثلثۃ اما ان یرتبوہا علی الاول فالاول نزولاً او الاطول فما دونہا او الاقصر فما فوقہا فاذ لیس کذلک، فقد صح انہ امر رسول اللہ لا یعارض عن اللہ عز وجل لا یجوز غیر ذالک اصلا۔

"یعنی جو شخص یہ خیال کرتا ہے کہ آیات قرآنی اور اس کی سورتوں کی ترتیب اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے، اور نہ اس کے رسول کے حکم سے، ایسا شخص جاہل اور بہتان باندھنے والا ہے، کیا اس شخص نے یہ آیت نہیں سنی (جو آیت بھی منسوخ کرتے ہیں، یا بھلا دیتے ہیں اس کے عوض اس سے بہتر یا اس جیسی لا دیتے ہیں) اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آیۃ الکرسی اور آیۃ الکلالۃ کے بارے میں جو کچھ فرمایا ہے، وہ اس کے علم میں نہیں ہے۔ حدیث میں ہے، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جب کوئی آیت نازل ہوتی تو فرماتے یہ آیت فلاں سورت میں فلاں جگہ لکھ دیجائے، اگر لوگوں نے قرآن کو ترتیب دیا ہوتا، تو وہ اس کے تین ہی طریقے اختیار کرتے، یا ترتیب نزول مرتب کرتے، یا پہلے بڑی سورتیں رکھتے اسکے بعد چھوٹی، یا پہلے چھوٹی رکھتے اسکے بعد بڑی، لیکن جب یہ صورت نہیں ہے تو یقیناً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے مرتب ہونا ثابت ہے، اور یہ چیز خدا کی جانب سے ہونے کے معارض نہیں ہے، اس کے علاوہ اور کوئی بات ہرگز صحیح نہیں ہے۔"

(کتاب الفصل)
(ج ۴ ص ۲۲۱)

قسط ۲:-

ایمان اور کُفر کا معیار

قرآن و حدیث کی روشنی میں!

(مولنا خالد محمود ایم۔ اے)

تتمۂ بحثِ مانعینِ زکوٰۃ بعض اہل علم ان مانعینِ زکوٰۃ کو کافر کی بجائے باغی قرار دیتے ہیں اور ان کے انکارِ زکوٰۃ کی توجیہ یوں کرتے ہیں کہ وہ لوگ زکوٰۃ کے فرض ہونے کے منکر نہیں تھے بلکہ اُن کا منشاءِ انکار یہ غلط فہمی تھی کہ نبیؐ کے بعد خلفاء کو زکوٰۃ وصول کرنے کا کوئی حق نہیں ہے، ان حضرات کے نزدیک یہ جہادِ صدیقی، 'جہادِ کفار' کی بجائے 'جہادِ بغاۃ' تھا جو بجائے خود اسلامی جہاد کی ایک مستقل نوع اور اسلام کا ایک مستقل مسئلہ ہے۔

امام دار الہجرۃ حضرت امام مالکؒ لکھتے ہیں:-

"الامر عندنا ان کل من منع فریضۃً من فرائض اللّٰہ تعالٰی فلم یستطع المسلمون اخذھا کان حقاً علیھم جھادہ"

(مؤطا ج۱ صفحہ ۲۰۱ مصر)

"ہمارا فتوٰی یہ ہے کہ ہر وہ شخص جو فرائض اسلام میں سے کسی ایک کا انکار کرے اور مسلمان اس کی وصولی کی استطاعت نہ رکھتے ہوں، تو مسلمانوں پر اس سے جہاد کرنا فرض ہے۔"

امام الائمہ حضرت امام محمدؒ فرماتے ہیں:-

"ان اھل بلدۃٍ او قریۃٍ اذا اجمعوا علٰی ترک الاذان فان الامام یقاتلھم و کذالک کل شئی من شعائر الاسلام"

"تحقیق کسی شہر یا کسی بستی کے رہنے والے اگر 'ترکِ اذان' پر اتفاق کرلیں تو خلیفہ کے لئے ضروری ہے کہ اُن سے جہاد کرے اور یہی حکم شعائر اسلام میں سے ہر ایک کے ترک کا ہے۔"

ہاں ان باغیوں پر کُفر کا حکم صرف اس وقت تک نہیں جب تک کہ اُن پر حجت نہ قایم کردی جائے اور انہیں توبہ کی طرف نہ بُلایا جائے لیکن اگر پھر بھی یہ لوگ اپنے موقف پر اصرار کریں تو پھر حکم کُفر سے نہیں بچ سکتے۔ کیوں کہ یہ چیز صریحاً ترکِ اسلام پر ایک دلیل ہے۔

شیخ الاسلام حافظ ابن حجر عسقلانی رحؒ لکھتے ہیں:-

"استقر الاجماع فی حق من جحد شیئاً من الفرائض بشبھۃٍ فیطالب بالرجوع فان نصب القتال قوتل واقیمت علیہ الحجۃ فان رجع والا عومل معاملۃ الکفار"

(فتح الباری ج ۱۲ صفحہ ۲۴۸)

"اس بات پر اجماع منعقد ہوچکا ہے کہ جو شخص کسی تاویل کی بناء پر فرائض اسلام میں سے کسی ایک کا انکار کرے، اُسے توبہ کی طرف بُلایا جائے، پس اگر مقابلہ کرے تو اس سے جہاد کیا جائے اور اُس پر حجت قائم کردیجائے اگر پھر بھی تائب ہوجائے تو فبہا ورنہ کفار جیسا برتاؤ اُس کے ساتھ کیا جائے۔"

اِس سے ثابت ہوا کہ جن لوگوں کے نزدیک یہ "جہادِ بغاۃ" تھا "جہادِ کفار" نہ تھا اُن کا مقصد مانعینِ زکوٰۃ کے اسلام پر حکم کرنا نہیں، بلکہ اُن پر حجت قائم کرکے اور اُنہیں توبہ کی طرف بُلا کر ان کے حکمِ تکفیر میں انتظار کرنا تھا۔ پس یہ حکمِ کُفر میں تاخیر ہے حکمِ کفر سے نجات نہیں!

صرح بہ الشیخ الانور فی الاکفار ص۱۶ "فان تاب والاحکم علیہ بالکفر فھذا غایتہ لا النجاۃ بالتاویل"۔

یہ تحقیق اور تفصیل تو ان حضرات کی رائے کے پیش نظر تھی، جو مانعین زکوٰۃ کو "اصل زکوٰۃ" کا منکر نہیں بلکہ "ادائے زکوٰۃ" کا منکر سمجھتے ہیں اور اس طرح اُن کے حکم کفر میں تاخیر سے کام لیتے ہیں۔ لیکن حق یہ ہے کہ یہ لوگ زکوٰۃ کی ایک اصل اسلامی سے منکر ہو کر کل اسلام سے ہی دست بردار ہو چکے تھے۔

اگرچہ مناظرۂ شیخین اور استدلال حضرت صدیق اکبرؓ کی تفصیل میں پورے شرح وبسط سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ "جہادِ صدیقی" "جہادِ بغاۃ" نہیں بلکہ "جہادِ کفار" تھا۔ لیکن اپنے دعوے کی تائید میں مزید خارجی شہادت کے لئے میں اسلامی تاریخ کے مختلف دوروں میں سے اُن چار بزرگوں کے نام پیش کرتا ہوں:۔

(۱) افضل الصحابہ بالتحقیق امیر المومنین حضرت ابوبکر صدیق رضؓ

(۲) امیر المومنین فی الحدیث حضرت الامام محمد بن اسمٰعیل بخاریؒ۔

(۳) بحر العلوم شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہؒ۔

(۴) خاتم المحدثین والفقہاء حضرت امام مولانا سید محمد انور شاہ صاحبؒ

حضرت صدیق اکبرؓ:۔

مانعین زکوٰۃ سے جہاد کرکے اُن پر فتح پانے کے بعد صحابہ میں یہ اختلاف ہوا کہ اُن کے اموال واولاد کو جہاد کفار کے ماتحت رکھا جائے یا اُن سے "جہاد بغاۃ" کے ماتحت سلوک کیا جائے؟

حافظ ابن حجر عسقلانیؒ لکھتے ہیں:۔

"وقد اختلف الصحابۃ فیھم بعد الغلبۃ علیھم ھل تغنم اموالھم وتسبی ذراریھم کالکفار او لا کالبغاۃ فرای ابوبکر الاول وعمل بہ" (فتح الباری ج ۱۲ ص۲۴۸)

"اُن پر غلبہ حاصل کرنے کے بعد صحابہ میں اختلاف ہوا کہ کیا "جہاد کفار" کے ماتحت اُن کے اموال غنیمت اور اُن کی اولاد گرفتار قرار دئے جائیں یا "جہادِ بغاۃ" کے ماتحت اس طرح نہ کیا جائے؟ حضرت ابوبکر کا فیصلہ یہی تھا کہ یہ کفار ہیں اور آپ نے اُن سے "جہادِ کفار" کا ہی سلوک کیا"۔

امیر المومنین فی الحدیث:۔

حضرت امام بخاریؒ نے مانعین زکوٰۃ اور قتالِ ابی بکر کی حدیث پر مندرجہ ذیل باب باندھا ہے، اور یہ چیز طے شدہ ہے کہ امام بخاریؒ کا فہم وتفقہ اُن کے تراجم اور ابواب ہی ہیں۔

"باب قتل من ابی قبول الفرائض وما نسبوا الی الردۃ" (صحیح بخاری ج ۲ ص۱۰۲۳)

"یہ باب ان لوگوں کے قتل اور ارتداد کی طرف منسوب ہونے کے متعلق ہے جو فرائض کے قبول کرنے سے انکار کر دیں"۔

حافظ عسقلانیؒ کے نزدیک "ما نسبوا" میں "ما" مصدریہ ہے، (ای ونسبتھم الی الردۃ فتح الباری پ۲۸ ص۲۳۰) اور شیخ الاسلام حضرت علامہ عینیؒ اسے موصولہ قرار دیتے ہیں (والتقدیر وقتل الذین نسبوا الی الردۃ۔ عینی جلد ۱۱ ص۲۳۶)

بہر حال حضرت امام بخاریؒ ان مانعین زکوٰۃ کو باوجود متاولین اور کفر الحاد کا مرتکب ہونے کے مرتد قرار دیا ہے پس یہ بھی ثابت ہوگا، کہ قطعیات اسلام میں تاویل کفر وارتداد سے نہیں بچا سکتی۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ

(۱) "السلف قد سموا مانعی الزکوٰۃ مرتدین مع کونھم یصومون ویصلون"۔

"سلف صالحین نے مانعینِ زکوٰۃ کو باوجودیکہ وہ روزے بھی رکھتے تھے، اور نمازیں بھی پڑھتے تھے "مرتد" قرار دیا ہے"۔

(فتاوٰے ابن تیمیہؒ مطبوعہ مصر ج ۴ ص۲۹۱)

ایک دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:۔

(۲) "والصواب ان ھؤلاء لیسوا من البغاۃ المتاولین فان ھؤلاء لیس لھم تاویل سائغ اصلا وانما ھم من جنس الخوارج المارقین ومانعی الزکوٰۃ واھل الطائف

"صحیح بات یہ ہے کہ یہ لوگ متاولین باغیوں میں سے شمار نہ ہوں گے کیوں کہ ان کے پاس تاویل کی کوئی گنجائش نہیں ہے، وہ اسلام سے نکلنے والے خوارج، مانعین زکوٰۃ، اہل طائف خرمیہ اور ان جیسے دوسرے

والجرمیۃ ونحوھم ممن قوتلوا علی ماخرجوا من شرائع الاسلام وھذا موضع اشتبہ علی کثیر من الناس۔"

لوگوں کی جنس میں شمار ہوں گے، جن سے اسلامی جہاد صرف اس لئے کیا گیا کہ وہ شرائعِ اسلام سے ہی نکل چکے تھے اور یہ مقام بہت سے اہلِ علم پر مشتبہ رہا ہے۔"

(فتاوے جلد ۴ صفحہ ۳۰۰)

(۳) ایک اور مقام پر لکھتے ہیں :-

"ان المسلم الاصلی اذا ارتد عن بعض شرائعہ کان اسوأ حالاً ممن لم یدخل بعد فی تلک الشرائع مثل مانعی الزکوٰۃ وامثالھم ممن قاتلھم الصدیق"

"تحقیق ایک پکا مسلمان جب بعض شرائعِ اسلام سے مرتد ہو جائے تو اس کا حال اُن لوگوں سے بھی بُرا ہوگا جو ابھی تک اس دائرے میں داخل نہیں ہوئے جیسے مانعینِ زکوٰۃ اور اُن کے دوسرے ساتھی جن سے حضرت صدیق اکبرؓ نے جہاد کیا تھا۔"

(فتاوے جلد ۴ صـ ۲۹۳)

خاتم المحدثین والفقہاء حجۃ الاسلام حضرت امام العصر مولٰنا سیّد محمّد انور شاہ صاحبؒ

"ان الایمان اسم للالتزام کل الدین فمن فرق بین الصلوٰۃ والزکوٰۃ فکانہ لم یؤمن بالکل فھو کافر قطعاً وھو نظر الحنفیۃ ان الایمان لایزید ولا ینقص لانہ لا تشکیک فی الالتزام۔" (فیض الباری ج ۱ صفحہ ۱۰۸ مصر)

"تحقیق ایمان پورے دین کے التزام کا نام ہے پس جو کوئی نماز اور زکوٰۃ میں سے ایک کو مانے اور ایک کو نہ مانے تو گویا کہ وہ پورے دین پر ایمان نہیں رکھتا پس وہ یقیناً کافر ہے اور یہی مفہوم اس باب میں حنفیہ کرام کی اصل ہے کہ ایمان زیادتی اور کمی کو قبول نہیں کرتا کیونکہ التزام میں تفاوت ہو ہی نہیں سکتا۔"

یہی مضمون حضرت شاہ صاحبؒ نے 'اکفار الملحدین' مطبوعہ دیوبند کے صـ ۲۳ سے صـ ۳۶ تک مختلف ضمنیات میں ارشاد فرمایا ہے۔

اِن حقائق اور شواہد سے واضح ہے کہ صحابہ کرام، محدثینِ عظام اور اِس اُمت کے اکابر و اعیان کے نزدیک شرائعِ اسلام کے باب میں "انکارِ بعض" اور "انکارِ کل" میں کوئی اصولی فرق نہیں۔ "ایمانِ بالبعض اور انکارِ بالبعض" اور کفر خالص عدالتِ اسلام میں ایک ہی مقام رکھتے ہیں۔

تنبیہ: سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر "ایمان بالبعض اور انکار بالبعض" کا کفر خالص ہونا اتنا ہی یقینی اور قطعی تھا جتنا کہ دلائل مذکورۃ الصدر سے ظاہر ہے تو پھر حضرت فاروقِ اعظمؓ نے حضرت صدیق اکبرؓ سے ابتداء میں اختلاف کیوں کیا تھا؟

جواباً عرض ہے کہ یہ اختلاف اس لئے نہ تھا کہ حضرت فاروقِ اعظمؓ بعض اسلام کے انکار کو کل اسلام کے انکار کے مترادف نہ سمجھتے تھے بلکہ اس لئے تھا کہ حضرت فاروقِ اعظمؓ انھیں بعض اسلام یا "اسلام کی ایک قطعی اصل زکوٰۃ" کا منکر ہی نہ جانتے تھے اور سمجھتے تھے کہ یہ لوگ فریضۂ اسلام سے تو منکر نہیں صرف حرص و لالچ کے باعث ادائیگی سے انکار کر رہے ہیں۔ پس یہ اختلاف نفسِ مسئلہ میں نہ تھا بلکہ کشفِ حال میں تھا۔ اگر حضرت فاروقِ اعظمؓ کو اس کا پتہ چل جاتا کہ یہ لوگ فرضیتِ زکوٰۃ سے ہی منکر ہیں تو وہ کبھی اختلاف نہ کرتے کیوں کہ بعض اسلام کا انکار 'کفرِ خالص' کے برابر ہونا اسلام کا ایک قطعی اور یقینی فیصلہ ہے۔

چنانچہ اِس خیال کی تائید حضرت عمرؓ کی مندرجہ ذیل حدیث سے بھی ہوتی ہے :-

عن عمر بن الخطابؓ قال لان اکون سألت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن ثلاث احب الیّ من حمر النعم (۱) من الخلیفۃ بعدہ (۲) وعن قوم قالوا نقر بالزکوٰۃ

"حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ یہ چیز مجھے دُنیا کی عزیز ترین دولت سے زیادہ محبوب تھی اگر میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اِن تین امور کے بارے میں دریافت کیا ہوتا اولاً یہ کہ آپ کے بعد خلیفہ کون ہو، ثانیاً جو قوم یہ کہے کہ ہم اپنے مالوں کی

فی اموالنا ولا نؤدّیھا الیک فیحل قتالھم۔

زکوٰۃ کی فرضیت کا اقرار کرتے ہیں لیکن آپ کو نہیں دیں گے کیا اُن سے جہاد کرنا جائز ہے؟

(۳) وعن الکلالۃ"

تاآنکہ وراثت کے باب میں "کلالہ" کا کیا حکم ہے؟"۔

ھٰذا حدیث صحیح علی شرط الشیخین

(مستدرک جلد ۲ ص ۳۰۳)

حافظ الحدیث حضرت علامہ جمال الدین زیلعیؒ (المتوفی ۷۶۲ھ) لکھتے ہیں:۔

"ان عمر لم یتحقق ردتھم یدل علی ذالک فی القصہ ان ابا بکر لما استشارھم فیھم قال لہ عمر یا خلیفۃ رسول اللہ انھم قوم مؤمنون و انما شحوا باموالھم۔"

(نصب الرایۃ ج ۳ ص ۲۵۲)

"حضرت عمرؓ کے نزدیک ان کا ارتداد متحقق نہ ہوچکا تھا اس کا ثبوت اسی سے ملتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے جب مانعین زکوٰۃ کے بارے میں مشورہ کیا تو حضرت عمرؓ نے کہا 'اے خلیفہ رسول! یہ مومن لوگ ہیں ان کا زکوٰۃ نہ دینا (انکار فرائض کی وجہ سے نہیں) صرف حرص و لالچ کی وجہ سے ہے۔"

مزید تفصیل کے لئے حافظ ابن تیمیہؒ کی منہاج السنۃ ج ۲ ص ۲۳۳ اور جلد ۳ ص ۲۳۱ اور حافظ ابن حزمؒ کی الملل والنحل ج ۵ ص ۷۹، کو بھی زیر نظر رکھا جائے۔

مانعین زکوٰۃ پر فتح پانے کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے اُن کی اولاد کو قید کردیا تھا کیوں کہ جہادِ کفار میں فتح حاصل کرنے کے بعد اسلام کا یہی فیصلہ ہے کہ اُن کے اموال غنیمت اور اُن کی اولاد غلام ہے چنانچہ وہ برابر قید رہے یہاں تک کہ حضرت فاروق اعظمؓ خلیفہ مقرر کرلئے گئے۔ علامہ شہرستانی اپنی 'الملل والنحل' میں لکھتے ہیں

"وقد ادی اجتہاد عمر فی ایام خلافتہ الی رد السبایا والاموال الیھم و اطلاق المحبوسین منھم۔"

"حضرت عمرؓ کا اپنے ایام خلافت میں یہی فیصلہ ہوا کہ ان کے اموال اور اولاد انہیں واپس کردیے جائیں اور اُن کے قیدیوں کو رہا کردیا جائے۔"

(الملل والنحل ج ۱ ص ۱۸ مصر)

ایک غلط فہمی کا ازالہ:۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر حضرت فاروق اعظمؓ کو یہ معلوم ہوچکا تھا کہ حضرت ابوبکرؓ حق پر تھے اور ان کے فیصلے اسلام کی صحیح تعبیر تھے تو انہوں نے اپنے ایام خلافت میں اُن کے ساتھ جہادِ کفار کے بقایا کا سلوک کیوں نہ کیا؟

جواباً عرض ہے کہ یہ احتمال اِس استدلال کو باطل کرتا ہے کہ ہوسکتا ہے کہ مقابلے کے وقت وہ لوگ واقعی مرتد ہوں اور ناکامی کے بعد اپنے موقف کو بدل کر یہ بہانہ کرتے ہوں کہ ہم زکوٰۃ کے فریضۂ اسلام ہونے سے منکر نہیں بلکہ ہمیں حرص و لالچ نے زکوٰۃ کی ادائیگی سے روک دیا تھا۔

"واللہ ما رجعنا عن الاسلام و انما شححنا باموالنا، فابی ابوبکر ان یدعھم"

(نصب الرایہ حافظ زیلعی ج ۳ ص ۲۵۲)

"خدا کی قسم ہم اسلام سے مرتد نہیں ہوئے سوائے اسکے نہیں کہ ہمنے اپنے مالوں کے ساتھ حرص اور لالچ کیا۔ حضرت ابوبکرؓ نے اُن کے اس بہانے کو قبول نہ کیا۔"

غایت مافی الباب یہ لازم آتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کا اپنی اپنی خلافت میں یہ اختلافِ عمل ان لوگوں کے بہانے یا اُن کی توبہ کے قبول کرنے یا نہ کرنے کے متعلق ہے اس میں نہیں کہ تحقیق مسئلہ اور کشفِ حال میں اُن کے جو تصفیے ہوئے تھے وہ ناتسلی بخش تھے۔ حضرت عمر فاروقؓ کا فیصلہ شرائع اسلام میں سے بعض کے انکار کو کفر خالص سمجھنے میں وہی تھا جو حضرت صدیق اکبرؓ کا تھا کشف حال اور قبول توبہ میں اختلاف ہونا اور بات ہے اور نفس مسئلہ میں اختلاف ہونا امر دیگر ہے۔ کفر اور اسلام کا معیار اسلام اور سب اکابر اسلام کے نزدیک ایک ہی ہے۔

فاروق اعظمؓ کے نزدیک کفر کی حقیقت:۔

عن علیؓ قال شرب نفر من اھل الشام الخمر و

"حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ شام کے کچھ لوگوں نے شراب پی

علیہم یومئذ یزید بن ابی سفیان وقالوا ھی حلال وتأولوا "لیس علی الذین اٰمنوا وعملوا الصٰلحٰت جناح فیما طعموا" الآیۃ فکتب فیھم الی عمرؓ فکتب عمرؓ ان ابعث بھم الیّ قبل ان یُفسدوا من قبلک فلما قدموا علی عمرؓ استشار فیھم الناس فقالوا یا امیر المومنین نریٰ انھم قد کذبوا علی اللہ وشرعوا فی دینھم مالم یاذن بہ اللہ فاضرب اعناقھم" وعلیؓ ساکت فقال "ما تقول یا ابا الحسن فیھم" قال "اریٰ ان تستتیبھم فان تابوا ضربتھم ثمانین ثمانین بشربھم الخمر وان لم یتوبوا ضربت اعناقھم قد کذبوا علی اللہ وشرعوا فی دینھم مالم یاذن بہ اللہ" فاستتابھم فتابوا فضربھم ثمانین ثمانین (طحاوی ج۲ ص۹۹)

(فتح الباری ج۱۲ ص۶۴)

اور کہا کہ یہ حلال ہے اور اس آیت کی تاویل کی کہ "ایمان لانے والوں اور نیک عمل کرنیوالوں پر کوئی گناہ نہیں جو وہ کھائیں، کھائیں" اُن کا گورنر اُن دنوں یزید بن ابی سفیانؓ تھا اُس نے ان کا معاملہ حضرت عمرؓ کی خدمت میں لکھ بھیجا۔ آپ نے جواب لکھا کہ اس سے پہلے کہ وہ فساد کریں انھیں میری طرف بھیجو پس جب وہ حضرت عمرؓ کے پاس پہنچے تو آپ نے ان کے متعلق مشورہ کیا سب نے کہا کہ اے امیر المومنین! انہوں نے اللہ تعالےٰ پر افتراء باندھا ہے اور بغیر اذن الٰہی دین میں ایک نئی بات داخل کی ہے پس اُن کی گردنیں اُڑا دیجئے۔" اور حضرت علیؓ خاموش رہے اس پر آپ نے پوچھا، کہ اے ابو الحسن! تمہاری کیا رائے ہے؟ آپ نے فرمایا کہ "آپ انہیں توبہ کی طرف بلائیں اگر وہ توبہ کرلیں تو پھر انھیں شراب پینے کے جرم میں اسّی اسّی کوڑے لگائے جائیں اور اگر توبہ نہ کریں تو انہیں حدِّ ارتداد میں قتل کر دیا جائے۔" حضرت فاروق اعظمؓ نے انہیں توبہ کی طرف بلایا اور اُنھوں نے توبہ کرلی۔ پھر انھیں اسّی اسّی کوڑے لگائے۔"

(طحاوی ج۲ ص۹۹)

(فتح الباری ج۱۲ ص۶۴)

تفہیم آیت قرآنی اور دفع تاویل فاسد:-

جب اللہ تعالےٰ نے شراب کو حرام فرمایا اور اس کی تحریم واقعہ اُحد کے بعد واقع ہوئی تو بعض صحابہؓ نے دربارِ رسالت میں عرض کی:-

فکیف باصحابنا الذین ماتوا وھم یشربون الخمر قبل التحریم وکیف ببعضنا الذین قتلوا یوم احد شھداء والخمر فی بطونھم" (پ)

"ہمارے اُن بھائیوں کا کیا حال ہوگا جو حرمت سے پہلے شراب پیتے تھے اور اُسی حالت میں مرگئے اور ہمارے اُن ساتھیوں کا کیا حال ہوگا جو جنگِ احد میں اس حال میں شہید ہوئے کہ شراب اُن کے پیٹ میں تھی۔"

اِس پر اللہ تعالےٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:-

"لیس علی الذین اٰمنوا وعملوا الصالحات جناح فیما طعموا" (پ)

"جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کئے اُن پر کوئی گناہ نہیں جو وہ پہلے کھاتے پیتے رہے ہیں"

حضرت امام ملا علی قاریؒ لکھتے ہیں:-

"بیّن فیھا ان من طعم الشیٔ فی الحال التی لم یحرم فیھا فلا جناح علیہ اذا کان من المؤمنین المتّقین المصلحین" (شرح فقہ اکبر ص۲۰۱ ہند)

"اللہ تعالےٰ نے اس آیت میں بیان فرمایا کہ جس نے کوئی چیز ایسے حال میں کھائی کہ وہ حرام نہ ہوئی تھی تو اُس پر کوئی گناہ نہیں اگر وہ نیک متقی اور مومن ہو۔"

شام کے ان لوگوں نے جن کا سردار قُدامہ بن عبد اللہ تھا، اِس آیت میں یہ تاویلِ فاسد کی کہ اسے اپنے اصلی معنوں سے نکال کر حلّتِ شراب کی دلیل بنالیا اب باوجودیکہ یہ لوگ کلمہ گو تھے اور باقی سارے اسلام اور اس کے احکام کو تسلیم کرتے تھے حضرت فاروقِ اعظمؓ، حضرت علی مرتضیٰؓ اور جمہور صحابہ رضی اللہ عنہم نے اجماعی فیصلہ کیا کہ اگر یہ توبہ نہ کریں تو ان پر حدِّ ارتداد جاری کی جائے اور بعض اسلام کے انکار کو کل اسلام کا انکار قرار دے کر انہیں مرتد ہونے کے جرم میں قتل کر دیا جائے۔

حافظ ابن تیمیہ رح لکھتے ہیں:۔

"اجمع رای عمر رض و اهل الشوریٰ ان یستتاب هو واصحابه فان اقروا بالتحریم جلدوا وان لم یقروا به کفروا"
(الصارم المسلول ص۵۳۳)

"حضرت عمر رض اور ساری مجلس شوریٰ کا یہی فیصلہ تھا کہ قدامہ اور اس کے ساتھیوں کو توبہ کی طرف بلایا جائے اگر وہ شراب کے حرام ہونے کا اقرار کرلیں تو ان پر شراب پینے کی حد جاری کی جائے اور اگر اقرار نہ کریں تو کفاً (مرتد) قرار دیدیئے جائیں۔"

امام المتکلمین ملا علی قاری رح فرماتے ہیں:۔

اتفق هو وعلی بن ابی طالب رض وسائر الصحابة علی انهم ان اعترفوا بالتحریم جلدوا وان اصروا علی استحلالها قتلوا۔ (شرح فقہ اکبر ص۲۰۱)

"حضرت عمر رض، حضرت علی رض اور سب صحابہ کا اجماعی فیصلہ تھا کہ اگر وہ لوگ حرمت شراب کا اعتراف کرلیں تو ان پر کوڑوں کے ساتھ حد خمر جاری کی جائے اور اگر شراب کو حلال کہنے پر اصرار کریں تو مرتد ہونے کے جرم میں قتل کردیئے جائیں۔"

حضرت عمر فاروق رض نے انہیں توبہ کی طرف بلایا تو ان لوگوں نے اپنے جرم کا اقرار کرلیا اور یہاں تک نادم ہوئے کہ خیال کرنے لگے کہ شاید ہمارا گناہ کبھی معاف نہ ہوسکے۔

اس پر حضرت عمر رض نے انہیں لکھا:۔

حٰمٓ۔ تنزیل الکتاب من الله العزیز العلیم۔ غافر الذنب وقابل التوب شدید العقاب ذی الطول لا ادری ای ذنبك اعظم استحلالك المحرم اولاً ام یاسك من رحمة الله ثانیاً

"حٰمٓ (اس کے معنے اللہ ہی کو معلوم ہیں) یہ کتاب اللہ کی طرف سے اتاری گئی ہے جو زبردست ہے، ہر چیز کا جاننے والا ہے، گناہ بخشنے والا ہے اور توبہ قبول کرنے والا ہے سخت سزا دینے والا ہے اور صاحب قدرت ہے، میں نہیں جانتا کہ تیرا کونسا گناہ زیادہ بڑا ہے پہلے حرام کو حلال سمجھنا یا پھر اللہ تعالےٰ کی رحمت سے مایوس ہوجانا۔"

(شرح فقہ اکبر ص۲۰۱)

خلافتِ فاروقی کے اس پورے واقعہ سے مندرجہ ذیل فوائد حاصل ہوئے:۔

۱۔ ہر اس عقیدہ اور فعل پر جو نفیاً یا اثباتاً آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے بطریق قطع ویقین ثابت ہو، پر ایمان رکھا جائے اور ان میں سے کسی ایک کے انکار کو بھی موجب کفر قرار دیا جائے۔

۲۔ حضرت فاروق اعظم رض اور تمام صحابہ کے نزدیک ہر ایسی بات کے انکار سے انسان کافر ہوجاتا ہے جو یقینی اور قطعی طور سے حضور صلعم کی تعلیم ہو اور کلمۂ طیبہ کا اقرار اُسے مرتد ہونے سے نہیں بچاسکتا

۳۔ اسلام کے کسی قطعی اصول کا صراحتاً انکار یا اس میں تاویلِ فاسد شریعت کی نگاہ میں برابر کے جرم ہیں "ضروریات دین میں تاویلِ فاسد کرنے والے کلمہ گو" اور کافر مطلق میں شرعاً کوئی فرق نہیں اول کفر الحاد اور ثانی کفر انکار ہے۔

۴۔ اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہوا کہ اسلام کی نظر میں اعتقاد اور عمل دو علیحدہ علیحدہ چیزیں ہیں کیوں کہ اگر ان دونوں میں کوئی فرق نہ ہوتا تو حضرت فاروق اعظم رض اور حضرت علی مرتضیٰ اپنے اجماعی فیصلے میں ان کے اقرارِ حرمت اور عدم اقرارِ حرمت کا کوئی فرق نہ کرتے۔ نیز اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ کفر وایمان کا مدار اعتقاد کے ساتھ ہے عمل کے ساتھ نہیں ہاں ایمان کی حلاوت عمل کے ساتھ ہی نصیب ہوتی ہے اور یہ امر دیگر ہے۔

۵۔ اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہوا کہ مرتد کی سزا قتل ہے، نیز یہ بھی ثابت ہوا کہ حضرت علی رض کے نزدیک شراب پینے کی سزا اسّی کوڑے تھے۔

۶۔ اِس حدیث سے یہ بھی ثابت ہوا کہ محرّمات کے حرام ہونے کا اقرار کرنے کے باوجود جو لوگ عملاً شرعی حدود سے تجاوز کریں تو اسلامی حکومت پر فرض ہے کہ ان پر مواخذہ کرے۔

۷۔ اِس حدیث سے یہ بھی ثابت ہوا کہ اللہ تعالےٰ کی رحمت سے مایوسی کفر ہے کیوں کہ حضرت فاروق اعظم رض نے اسے حرام کو حلال کرنے کے برابر کا گناہ قرار دیا ہے اور ظاہر ہے کہ شریعت کی نگاہ میں حرام کو حلال کرنا قطعی کفر ہے۔

۸- اِس حدیث سے یہ بھی ثابت ہوا کہ جو لوگ شریعت کی حرام کردہ اشیاء جیسے شراب کا استعمال، بے پردگی اور رشوت ستانی وغیرہ کو اعتقاداً حلال سمجھتے ہیں وہ اسلامی نقطۂ نظر سے مرتد ہیں۔

۹- اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کسی آیت کے ان معنوں اور اس مفہوم کو عمداً ترک کر دینا جو صاحبِ شرع سے تواتر اور قطع ویقین کے ساتھ منقول ہے اور اُمت اُسے اسی پیرایہ میں قبول کرتی چلی آئی ہے موجب کفر ہے اور اس کا مرتکب کافر ہے جیسے کہ آیت خاتم النبیین کے متواترہ معنوں یا نماز کے معروف مفہوم کا انکار کر کے کسی تاویلِ فاسد کو سہارا بنا لینا سب کفر کے ذیل میں داخل ہیں۔

۱۰- ایمان باعتبار کمیت زیادتی اور کمی کو قبول نہیں کرتا جتنے امور پر حضرت فاروق اعظمؓ کا ایمان تھا اتنے امور پر ہی ایمان لانا ہر انسان کے مسلمان کہلانے کے لئے ضروری ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک شخص کا ایمان دس چیزوں پر ہو اور ایک کا نو پر، اور دونوں مسلمان ہوں یا مسلمان کہلائیں ایمان ایک شئی بسیط ہے ہوگا تو پورا ہوگا نہ ہوگا تو کچھ بھی نہ ہوگا، اگر ایمان میں زیادتی اور کمی ممکن ہوتی تو حضرت فاروق اعظمؓ فقط استحلال شراب سے ایمان "کم ہو گیا" بیان فرماتے کفر خالص اور ارتداد ہرگز نہ قرار دیتے۔ تلک عشرۃ کاملۃ

قرآن پاک، احادیث نبویہؐ، تعاملِ خلافت راشدہ اور اجماع صحابہؓ سے یہ حقیقت نقل کرنے کے بعد کہ دائرۂ کفر میں داخل ہونے کے لئے کل اسلام کا انکار ضروری نہیں بلکہ اسلام کی ایک قطعی بات کے انکار سے بھی انسان اسلام سے نکل کر کفر کے دائرے میں داخل ہو جاتا ہے۔ اب آپ کے سامنے دوسرے اکابرین اُمت کے فیصلے بھی پیش کئے جاتے ہیں۔

۱- حافظ ابن حزمؒ لکھتے ہیں:-

واما من قال ان الله عزوجل هو فلان لانسان بعينه أو ان الله يحل في جسم من اجسام خلقه او ان بعد محمد صلى الله عليه وسلم نبيا غير عيسى بن مريم فانه لا يختلف اثنان في تكفيره لصحة قيام الحجة بكل هذا على كل احد"

(کتاب الفصل ج ۳ ص ۲۴۹)

"اور جو شخص کسی انسان کے بارے میں یہ کہے کہ خدا بعینہ یہی ہے یا یہ کہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق میں سے کسی کے جسم میں حلول کرتا ہے اور یا یہ کہے کہ محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت عیسےٰ کے سوا اور کوئی نبی آسکتا ہے اُس کے کافر ہونے میں دو شخصوں کا بھی اختلاف نہیں کیوں کہ ان قطعیات میں سے ہر ایک کی ہر ایک پر حجت تمام ہو چکی ہے۔"

۲- فلاخلاف بین المسلمین ان الرجل لو اظهر انكار الواجبات الظاهرة المتواترة والمحرمات الظاهرة المتواترة فانه يستتاب فان تاب فيها والا قتل كافراً مرتداً۔

(شرح فقہ اکبر ص ۲۰۰)

"اِس مسئلے میں سب مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ اگر کوئی شخص قطع ویقین سے ثابت ہونے والی محرمات میں سے کسی ایک کا انکار کرے تو اُسے توبہ کی طرف بلایا جائے گا۔ پس اگر توبہ کر لے تو فبہا ورنہ کافر و مرتد سمجھ کر قتل کر دیا جائے گا۔"

۳- وفی المحيط من انكر الاخبار المتواترة في الشريعة كفر مثل حرمة لبس الحرير على الرجال ومن انكر اصل الوتر واصل الاضحية كفر۔ (شرح فقہ اکبر ص ۲۰۳)

"فقہ کی کتاب محیط میں ہے کہ جو شخص شریعت کی قطعی خبروں کا انکار کرے، جیسے کہ مردوں کے لئے ریشم پہننا حرام ہونا وغیرہ تو وہ کافر ہے اور اسی طرح وتر کا منکر یا قربانی کا منکر بھی کافر ہے۔"

۴- فقہ کی مستند کتاب "بحر الرائق" میں ہے:-

"والاصل ان من اعتقد الحرام حلالاً فان كان حراماً لغيره كمال الغير لا يكفر وان كان لعينه فان كان دليله قطعياً كفر والا فلا۔ فيكفر اذا

"جو شخص کسی حرام کو حلال سمجھے تو اگر اُس کی حرمت ذاتی نہیں بلکہ کسی امر خارج سے پیدا ہوئی ہے جیسے کہ دوسرے کا مال، تو اسے کافر قرار نہیں دیا جائے گا اور اگر اس حرام کی حرمت ذاتی ہو اور وہ حرمت بھی قطع ویقین سے ثابت ہو تو اُسے کافر قرار

قال الخمر لیس بحرام" دے دیا جائے گا۔ پس جو شخص کہے

(ر دالمحتار ج ۳ ص ۲۹۳) کہ شراب حلال ہے وہ قطعاً کافر ہے"

۵۔ قاضی عیاض علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں :۔

"وکذالک یقطع بتکفیر من کذب او انکر قاعدۃ من قواعد الشریعۃ وما عرف یقیناً بالنقل المتواتر من فعل الرسول صلی اللہ علیہ وسلم ووقع الاجماع المتصل علیہ کمن انکر وجوب الصلوٰۃ الخمس او عدد رکعاتہا وسجداتہا ویقول انما اوجب اللہ علینا فی کتابہ الصلوٰۃ علی الجملۃ وکونہا خمساً وعلی ھذہ الصفات والشروط لا اعلمہ اذلم یرد بہ فی القرآن نص جلی والخبر عن الرسول خبر واحد" (الشفاء)

"اور اسی طرح وہ شخص یقیناً کافر ہے جو قواعد شریعت میں سے کسی اصول یا کسی ایسے امر کی تکذیب اور انکار کرے جو حضورؐ سے قطعی اور نقل متواتر کے ساتھ ثابت ہو چکا ہو اور اس پر اجماع متصل بھی منعقد ہو گیا ہو جیسے کہ کوئی شخص پانچ نمازوں کی فرضیت کا انکار کرے یا فرض نمازوں کی رکعات سجدات کی مجموعی تعداد کا انکار کرے اور کہے کہ اللہ تعالیٰ نے نمازیں تو ہم پر ضرور فرض کی ہیں لیکن ان کا پانچ ہونا اور ان صفات وشروط کے ساتھ ہونا اسے میں نہیں جانتا کیوں کہ قرآن میں اس کی صراحت نہیں ہے، باقی رہی حدیث پیغمبر سو وہ خبر واحد ہے" (الشفاء)

۶۔ حضرت علامہ تفتازانی رحمۃ اللہ علیہ نے کفر کی تعریف اس طرح کی ہے :۔

"الجحد بما فی شیٔ مما علم قطعاً انہ من احکامہ" "جو امور قطعی طور پر ثابت ہو چکے ہیں کہ وہ اسلام کے احکام ہیں ان میں سے کسی ایک کا انکار کر دینا"

اور پھر اس پر یہ تفصیل فرمائی ہے :۔

"لان من النصوص ما علم قطعاً من الدین انہ علی ظاھرہ فتاویلہ تکذیب للنبی بخلاف البعض" (شرح مقاصد ج ۲ ص ۲۶۸ مصر)

"کئی ایسی نصوص بھی ہیں جن کے متعلق قطعی طور پر ثابت ہو چکا ہے کہ وہ اپنے ظاہر پر ہیں پس ان کی تاویل پیغمبر کی تکذیب کو لازم ہے بخلاف ان نصوص کی تاویل کے جن کا اپنے ظاہر پر ہونا قطعی اور یقینی نہ ہو"

۷۔ قاضی بیضاوی بھی لکھتے ہیں :۔

"الکفر لغۃ ستر النعمۃ واصلہ الکَفر بالفتح وھو الستر ومنہ قیل للزارع واللیل کافر ولکمام الثمرۃ کافور وفی الشرع انکار ما علم بالضرورۃ مجیٔ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم بہ"

"لغت عرب میں کفر ستر نعمت کو کہتے ہیں اس کی اصل کَفر ہے جس کے معنے پردے کے آتے ہیں، کسان اور رات کو بھی 'کافر' کہتے ہیں، پھل کے غلاف کو بھی 'کافور' کہا گیا ہے، اور شریعت محمدیہ میں کفر کے معنی کسی ایسے امر کا انکار ہے جس کا دین محمدی ہونا ضروری طور پر معلوم ہو چکا ہو"

(باقی آئندہ)

پاکستانی احباب سے ضروری گزارش

نداء حرم کراچی کے انتظام کے ٹوٹ جانے کے بعد پاکستان کے جن قدیم و جدید خریداروں کے نام رسالہ اس وعدہ پر جاری کیا گیا تھا کہ وہ ہمارے نئے پتہ پر رقم ارسال کر دینگے گزارش ہے کہ "مولانا محمد صاحب انوری مہتمم مدرسہ تعلیم الاسلام محلہ سنت پورہ لائلپور" کو اپنی رقم روانہ کر کے رسید دفتر کو بھیجدیں قدیم خریدار اپنے نمبر خریداری کا حوالہ بھی دیں۔ اگر یہ رقمیں آئندہ ہفتہ عشرہ میں وصول نہیں ہوئیں تو دفتر پرچہ بند کر لینے پر مجبور ہوگا۔ (ناظم)

بقیہ "اسلام میں حکومت کا درجہ"

مضمون کے موضوع سے خارج ہے اسلئے اسپر میں کوئی بحث نہیں کرنا چاہتا۔ مجھے تو صرف اتنا دکھانا تھا کہ اس مسئلہ کی دینی و شرعی حیثیت کیا ہے؟ وہ میں دکھا چکا۔ موجودہ دور میں اس کوشش کا مناسب یا نامناسب ہونا شرعی مسئلہ نہیں ہے، بلکہ عقلی مسئلہ جسمیں اختلاف کی کافی گنجائش ہے۔ شریعت صرف یہ بتاتی ہے کہ جب استطاعت ہو تو اس مقصد کیلئے جد وجہد واجب، لیکن استطاعت ہے یا نہیں؟ اور حالات سازگار ہیں یا نہیں؟ اس مسئلہ کا تعلق واقعات سے ہے نہ کہ احکام شرعیہ سے اور اس کا فیصلہ عقل کرتی ہے نہ کہ شریعت۔ اسمیں مختلف رائیں ہو سکتی ہیں۔ پھر یہ مسئلہ سامنے آتا ہو کہ اس کیلئے کیا ذرائع اختیار کئے جائیں؟ اسلئے ذرائع وطریق کار میں بھی زمانہ، حالات اور مقام کے لحاظ سے اختلاف ہوتا ہے۔ یہ مسئلہ بھی عقلی ہی ہے۔ ظاہر ہے کہ ان مسائل میں اُلجھ کر ہم اپنے اصل موضوع سے بہت دور جا پڑینگے۔ اس لئے ہم ان سب کو یہاں کلیۃً نظر انداز کرتے ہیں اور مخالفت یا موافقت میں کچھ بھی نہیں کہنا چاہتے۔ فقط

قسط ۳، ۱

اسلام میں حکومت کا درجہ

مولانا حکیم محمد اسحاق صاحب استاذ ندوۃ العلماء لکھنؤ

احادیث نبویہ کتاب حسین کے بعد سنت نبویہ علیہا الف الف تحیۃ کی طرف دیکھیے۔ سب سے پہلے ہماری نظر ایک حدیث کے اس ٹکڑے پر پڑتی ہے:-

ومن مات ولیس فی عنقہ بیعۃ مات میتۃ جاھلیۃ (مسلم کتاب الامارۃ باب وجوب لزوم الجماعۃ)

"جو شخص ایسی حالت میں مرجائے کہ اس کی گردن میں (کسی امیر کی) بیعت نہ ہو جاہلیت کی موت مرا"

یہ صاف وصریح حدیث کسی تشریح کی طالب نہیں ہے۔

عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من اطاعنی فقد اطاع اللہ ومن عصانی فقد عصی اللہ ومن یطع الامیر فقد اطاعنی ومن یعص الامیر فقد عصانی وانما الامام جُنّۃ یقاتل من ورائہ ویتقی بہ فان امر بتقوی اللہ وعدل فان لہ بذلک اجرا وان قال بغیرہ فان علیہ منہ (مشکوٰۃ کتاب الامارۃ والقضاء)

"حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی جو امیر کی اطاعت کرتا ہے وہ میرا مطیع ہے اور جو امیر کی نافرمانی کرتا ہے وہ میری نافرمانی کرتا ہے۔ بیشک امام وہ سپر ہے جس کے پیچھے ہو کر جنگ کیجاتی ہے اور اس کے ذریعہ سے حفاظت حاصل کیجاتی ہے پس اگر وہ تقویٰ کا حکم دے اور انصاف کرے تو اُسے ثواب ملیگا اور اسکے خلاف کرے تو گنہگار ہوگا"

حدیث متعدد اعتبارات سے مدعا کو واضح کر رہی ہے، آیۃ اطاعت اولی الامر میں ہم نے جس نوعیت کا استدلال کیا ہے اس کی بعض صورتیں یہاں بھی چسپاں ہوتی ہیں۔ لیکن ان سے قطع نظر کر کے اس وقت ہم صرف "انما الامام جنۃ یقاتل من ورائہ ویتقی بہ" کو پیش نظر رکھتے ہوئے منزل مقصود تک پہونچنا چاہتے ہیں۔

قتال و جہاد کا حکم قرآن و حدیث پیغمبر میں کتنی بار دیا گیا ہے؟ اس حکم کے لئے "جنۃ" (سپر) کا وجود ضروری ہے۔ پھر اس ضرورت کی تکمیل کیوں ضروری نہ ہوگی؟ "یتقی بہ" کی شرح دو طرح سے کی گئی ہے۔ پہلی تشریح کے اعتبار سے یہ سیاسی و حربی حفاظت کے ساتھ مخصوص ہے اور دوسری شرح کے لحاظ سے ہر قسم کے نقصانات اس کے ماتحت داخل ہیں، گویا یہ فرمایا گیا ہے کہ امام کے ذریعے سے دینی و دنیاوی ہر قسم کے نقصانات سے قوم محفوظ رہتی ہے۔ شرعاً اس حفاظت کی اہمیت و ضرورت میں کیسے کلام ہو سکتا ہے؟ اس کے بعد کیسے کہا جا سکتا ہے کہ اس ذریعہ کو حاصل کرنا ضروری نہیں ہے؟

عن ابی سعید الخدری رضؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا کان ثلثۃ فی سفر فلیؤمروا احدھم رواہ ابوداؤد (مشکوٰۃ باب آداب السفر الفصل الثانی)

"حضرت ابوسعید خدریؓ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تین آدمی سفر میں ہوں تو انھیں چاہئے کہ اپنے سے ایک کو امیر بنالیں"

غور فرمائیے کہ جس شریعت نے تین آدمیوں کی چھوٹی سی جماعت کو بھی اس کا حکم دیا ہے کہ وہ امیر سے خالی نہ رہے۔

وہ مسلمانوں کے پورے پورے شہروں اور ملکوں کو بغیر امیر کے رکھنا کس طرح گوارا کرسکتی ہے؟ کیا حدیث سے بطور نتیجہ صریح اقامتِ حکومت کا حکم نہیں نکلتا ہے؟

عن ابی ھریرۃؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من مات ولم یغزو لم یحدث بہ نفسہٗ مات علی شعبۃ من النفاق

"جو شخص اس حالت میں مرا کہ نہ تو اس نے جہاد کیا نہ دل میں اس کا کوئی منصوبہ ہی بنایا تو اس کی موت ایک قسم کے نفاق کی حالت میں ہوئی"

جہاد کا تصور بغیر حکومت کے تصور کے کیونکر ہوسکتا ہے؟ اگر اس کے متعلق فکر نہ کرنا اور اس کی خواہش اور تمنا نہ رکھنا، ایک شعبہ نفاق کی علامت ہے تو اقامتِ حکومت کے متعلق فکر و کوشش کیوں فرض نہ ہوگی۔ اسی حدیث کی بناء پر بعض حضرات تو اس کے قائل ہوئے ہیں کہ جہاد بھی فرض کفایہ نہیں بلکہ فرض عین ہے۔

علمائے اُمت کی رائے

کتاب و سنت کے بعد اب دیکھئے کہ اس بارے میں علم دین کے ماہرین اور اکابر علماء کی کیا رائے ہے؟ اور انھوں نے کتاب و سنت سے اس مسئلہ کے متعلق کیا سمجھا ہے؟

علامہ ابن حزمؒ کتاب الفصل جلد ۴ صـ۸۷ میں تحریر فرماتے ہیں:۔

اتفق جمیع اھل السنۃ وجمیع المرجئۃ و جمیع الشیعۃ وجمیع الخوارج علی وجوب الامامۃ و ان الامۃ واجب علیھا الانقیاد لامام عادل یقیم فیھم احکام اللہ ویولھم باحکام الشریعۃ التی اتی بھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

"سب اہل سنت، مرجئہ، شیعہ اور خوارج کا اس پر اجماع ہے کہ امام کا تقرر واجب ہے، اور یہ کہ اُمت پر ایسے امام عادل کی اطاعت واجب ہے جو ان میں اللہ تعالیٰ کے احکام نافذ کرے اور ان احکام شرعیہ کے مطابق ان کا سیاسی نظم قائم کرے جو نبی اکرم صلے اللہ تعالیٰ علیہ وسلم لائے تھے"

اس مسئلہ پر اُمت کا اجماع نقل فرمانے کے بعد علامہؒ تحریر فرماتے ہیں کہ اس بارے میں صرف خوارج کے ایک فرقہ نے اختلاف کیا ہے، اُن کا مسلک یہ تھا کہ:۔

لایلزم الناس فرض الامامۃ وانما علیھم ان یتعاطوا الحق۔

"لوگوں پر نصب امام فرض نہیں ہے بلکہ حق و شریعت کے مطابق تعامل کرنا واجب ہے"

لیکن چند خوارج کے اختلاف سے اس اجماع میں کیا نقص پیدا ہوتا ہے؟ ثبوت کے لئے تو صرف اہلسنت والجماعت کا اجماع کافی ہے اور وہ حاصل ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس وجوب کی تصریح کے ساتھ کچھ تشریح بھی فرمائی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:۔

مسئلہ واجب بالکفایہ است بر مسلمین الی یوم القیامۃ نصب خلیفہ مستجمع شروط۔

"مسلمانوں پر جامع شرائط خلیفہ کا مقرر کرنا واجب بالکفایہ ہے اور یہ حکم قیامت تک کے لئے ہے"

(ازالۃ الخفاء مقصد اول فصل اول در خلافت)

عقائد و کلام کی کتابوں میں امامۃ کی بحث ایک مستقل حیثیت رکھتی ہے اور فقہ و کلام کی کتابوں کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وجوب امامت کے بارے میں اہلسنت کے درمیان اور صحابہ سے لے کر ان کے زمانہ تک کوئی اختلاف کبھی نہیں ہوا۔ اور اختلاف ہو بھی کیسے سکتا تھا جبکہ کل اُمت کے پیشرو اور مقتدیٰ یعنی صحابہ کرام کا اجماع اس مسئلہ پر ہوچکا ہے۔ چنانچہ انہوں نے نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے دفن پر اسے مقدم رکھا۔

وفات نبوی صلے اللہ علیہ وسلم کے وقت حضرت صدیق اکبرؓ نے جو خطبہ دیا ہے اُس کے یہ الفاظ:۔

الا ان محمداً قد مات ولابد لھذا الدین ممن یقوم بہ

"خبردار ہوجاؤ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تو وفات پاچکے اور اس دین کے لئے ایسا شخص

صحابہ کرام کے پورے مجمع نے سُنا اور کسی نے اس سے اختلاف نہیں کیا بلکہ ان کے اس مشورے پر عمل کیا۔ کیا یہ اس مسئلہ پر اجماع صحابہؓ منعقد ہونے کا کھُلا ہوا ثبوت نہیں ہے؟

اس دلیل کی بناء پر صاحب مواقف اِس بارے میں اہلسنّت والجماعت کا اجماعی مسلک اس طرح ظاہر فرماتے ہیں:۔

نصب الامام واجب عندنا سمعًا۔ "امام کا تقرر ہمارے اوپر دلیل نقلی کی بناء پر واجب ہے۔"

اِس کے بعد فرق باطلہ میں بھی صرف خوارج کے بعض فرقوں کا اختلاف نقل فرماتے ہیں۔ گویا اِس مسئلہ پر تقریبًا کُل اُمت کا اجماع ثابت ہو۔ حالانکہ اگر صرف صحابہ کرام ہی کا اجماع پایا جاتا تو بعد کے لوگوں میں سے کسی کے لئے مجالِ اختلاف نہ باقی رہتی۔ اِس لئے کہ کل صحابہ کرام کا تخطیئہ کرنا اور ان سب "نجوم ہدایت" کی اقتداء سے روگردانی کرنا ایک سنی مسلمان کے لئے کیسے ممکن ہو؟

صاحب درمختار تو صحابہ کرام کے طرزِ عمل سے اس قدر متأثر ہیں کہ فرماتے ہیں:۔

ونصبه اهم الواجبات "امیر کو مقرر کرنا واجبات میں سب سے اہم واجب ہے۔"

علامہ قرطبی اپنی مشہور و معروف تفسیر میں آیۂ کریمہ "اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً" کی تفسیر فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"الرابعة - هذه الآية اصل" فی نصب امام و خلیفة یسمع و یطاع لتجتمع به الکلمة وتنفذ احکام الخلیفة ولا خلاف فی وجوب ذالک بین الامة ولا بین الائمة الا ما روی عن الاصم حیث کان عن الشریعة اصم۵

"چوتھی بات یہ ہے کہ یہ آیت ایسے امام و خلیفہ کے تقرر کے بارے میں ایک اصل ہے جس کی اطاعت و فرمانبرداری کی جائے۔ تاکہ اسی طریقہ سے کلمہ میں اجتماع پیدا ہو اور احکام خلیفہ کا نفاذ ہو (اس تقرر) کے واجب ہونے کے بارے میں نہ امت کے درمیان اختلاف ہے نہ ائمہ کے درمیان البتہ اصم سے اختلاف کی روایت ہے مگر اس کا اختلاف اس لئے ہے کہ وہ شریعت کی آواز سُننے سے قاصر ہے۔"

کچھ آگے بڑھ کر صحابہ کرام کے طرزِ عمل سے استدلال فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:۔ "فدل علی وجوبها وانها رکن من ارکان الدین الذی به دوام المسلمین والحمد لله رب العلمین"

(تفسیر قرطبی ج ۱ صہ ۲۶۴ مطبوعہ قاہرہ)

پانچواں مسئلہ

اِس قیمتی سفر کی ابتداء سوال اوّل سے ہوئی تھی مگر اس طویل راستہ میں ہمیں تنقیح پنجم کو مستثنیٰ کر کے ہر سوال کا جواب مِل گیا۔ یہ ثابت ہو چکا ہے کہ اقامتِ حکومت اسلامیہ ایک دینی حکم ہے، دین سے باہر کوئی شئی نہیں ہے اور اس کا درجہ فرض و واجب کا ہے۔ ان دونوں باتوں کے ثبوت کے بعد تیسرے سوال کی کیا گنجائش رہ جاتی ہے؟ چوتھی تنقیح پر اطمینان بخش بحث انھیں صفحات میں ہو چکی ہے۔ اِس کے بعد بجز تنقیح پنجم کیا چیز قابلِ بحث باقی رہ جاتی ہے؟ یعنی اب دیکھنا یہ ہے کہ اقامتِ حکومت اسلامیہ کا حکم احکام مقصودہ (مثل صلوٰۃ وصوم) کی فہرست میں داخل ہے یا احکام غیر مقصودہ (مثل وضو و تیمم) کے ذیل میں آتا ہے؟ جواب کے لئے ایک مختصر تمہید ملاحظہ فرمانے کی تکلیف گوارا کرنی پڑے گی۔

احکام مقصودہ سے کیا مُراد ہے؟ اس مسئلہ کو حل کئے بغیر آغاز بحث ناممکن ہے۔

اگر مقصود سے مقصود بالذات مراد ہو تو اس حقیقت کا اقرار کرنا پڑے گا کہ کوئی حکم شرعی بھی مقصود بالذات نہیں ہے۔ یہاں تک کہ صوم و صلوٰۃ بھی مقصود بالذات نہیں ہیں۔ اصل مقصود درحقیقت حق تعالےٰ کی رضاء و خوشنودی ہے اور یہ سب اعمال اُس کے حاصل کرنے کے ذرائع اور طریقے ہیں۔

کسی عمل کو مقصود کہنے کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ یہ عمل رضاء الٰہی کا ذریعہ بلا واسطہ ہے۔ یعنی رضاء حق کا اصل تعلق اس عمل سے ہے، اور اسے وجود میں لانے سے حق تعالےٰ کی رضامندی حاصل ہوتی ہے، اس کے مقابلہ میں غیر مقصود اعمال وہ ہوں گے جو قربِ رضاء الٰہی کا ذریعہ بلا واسطہ نہ بن سکیں بلکہ اعمال مقصودہ کے

۵ یہ معتزلی تھا ۱۲ منہ

واسطہ سے بن سکیں۔ نماز اور وضو کی مثال وضاحت کے لئے کافی ہے۔ نماز وہ حکم اور عمل ہے جو منزلِ قربِ رضا تک پہونچنے کا ذریعہ ہے۔ لیکن وضو میں یہ بات نہیں، ثواب اس پر بھی ملتا ہے۔ قرب اس سے بھی حاصل ہوتا ہے، رضاء ربّ العالمین کے کاخِ بلند تک پہونچنے کا زینہ یہ بھی ہے۔ مگر نماز یا اسی قسم کی دوسری عبادات کے واسطہ سے، فی نفسہ وضو کوئی قابلِ ثواب شئے نہیں قرار دی گئی ہے۔ بلکہ اس پر اجر اسی لئے ملتا ہے کہ وہ عبادات مقصودہ کا ذریعہ ہے۔ فرض کیجئے کہ ایک شخص وضو تو بار بار کرتا ہے لیکن نماز یا کسی ایسی ہی عبادت کے لئے نہیں کرتا، تو اُسے کوئی اجر و ثواب نہیں ملے گا۔

میں آپ کو مزید انتظار کی زحمت نہیں دینا چاہتا تمہید کو ختم کر کے اصل موضوع کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔

دیکھنا یہ ہے کہ اقامتِ حکومت اسلامیہ فی نفسہ قربِ الٰہی کا ذریعہ ہے یا نہیں؟ فرض کیجئے کہ جواب نفی میں ہے، اور ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ یہ حکم مقصود نہیں ہے تو ہماری عملی زندگی پر اس کے کیا اثرات پڑیں گے۔ جو حضرات اس کے قائل ہیں کہ "اقامتِ حکومت" مقصود نہیں ہے وہ اس سے مندرجہ ذیل نتائج نکالتے ہیں:۔

چونکہ یہ عمل مقصود نہیں ہے اس لئے (الف) اس کے لئے جد و جہد میں کوئی اجر و ثواب نہ ہوگا (ب) اس کی کوشش کے لئے دعوت دینا جائز نہیں ہے (ج) اس غیر مقصود میں مشغولی اصل مقصود سے غافل کر دے گی (د) دین میں اس کا درجہ بہت گھٹ جاتا ہے یہاں تک کہ نفل نماز اس سے کہیں بہتر ہے۔

ان نتائج میں سے ایک بھی صحیح نہیں ہے۔ ان کی غلطی ابھی واضح ہوئی جاتی ہے۔

فرض کر لیا گیا ہے کہ جو چیز شرعاً غیر مقصود ہوگی اُس میں مندرجہ بالا کمزوریاں ضرور پائی جائیں گی، یہ مفروضہ ہی سرے سے غلط ہے۔ بہت سے اعمال دینیہ ایسے ہیں جن کا غیر مقصود ہونا بالکل واضح ہے لیکن دین میں اُن کی اہمیت بہت سے اعمالِ مقصودہ کے برابر ہے۔ مروجہ طرز کے مدارس اور خانقاہوں کا قیام فی نفسہ کہاں مقصود ہے؟ لیکن اُن کی اہمیت سے کس کو انکار ہو سکتا ہے؟ کیا ان کے لئے کوشش کرنا اور ان کے قیام کی دعوت دینا نفل نمازوں اور نفل روزوں سے کہیں زیادہ افضل باعث اجر و ثواب اور ذریعہ قرب الٰہی نہیں ہے؟ اور اس غیر مقصود کے لئے کوشش میں مشغولیت مقصود سے قریب کرنے والی ہے یا بعید؟ اُن سطروں کا مضمون تو غالباً ذہن میں ہوگا جس میں میں نے ثابت کیا ہے کہ انبیاء کرام سے خلافت و حکومت اسلامیہ کی دعوت دینا اور اس کے لئے کوشش کرنا ثابت ہے تو کیا انبیاء کرام بھی ایسی شئی کے لئے اپنے اوقاتِ عزیز کو ضائع کر سکتے ہیں جس میں کوئی اجر و ثواب نہ ہو؟ کیا صحابہ کرام دفن رسول پر ایسے کام کو مقدم کر سکتے تھے جس کی اہمیت دین میں نفل نماز کے برابر بھی نہ ہو؟ کیا اس نفل سے بھی نیچے درجے کی چیز کے لئے وہ واجب میں تاخیر کر سکتے تھے؟

اب مفروضات کے دائرے سے باہر آکر دقتِ نظر کے ساتھ حقیقت اور واقعہ کو تلاش کیجئے۔

اقامتِ حکومت اسلامیہ کا حکم، حکم مقصود ہے یا نہیں، اس کے معلوم کرنے کا صحیح اور سہل طریقہ یہ ہے کہ پہلے اس کی حقیقت کو معلوم کر لیا جائے۔ اصطلاحات کی غیر ضروری بندشوں سے آزاد رہتے ہوئے ہم حکومت کی تعبیر ایسے اقتدار کے ساتھ کر سکتے ہیں جس کے ذریعہ سے دوسروں کو، اپنے احکام کا پابند بنایا جا سکے۔ اقامتِ حکومت کا مطلب اسی اقتدار کا حصول ہے۔ اسلام کا بنیادی نظریہ ہے دنیا کی کوئی شئی بھی مقصود نہیں ہے۔ اس لئے خود یہ جاہ و اقتدار اس کے نزدیک کس طرح مقصود ہو سکتا ہے؟ جو شخص اس اقتدار کو مطلوب سمجھتا ہے وہ سخت گمراہی میں ہے۔ یہ چیز نہ صرف غیر مطلوب ہے بلکہ اس کی سخت ممانعت بھی ہے۔ قرآن مجید کا ارشاد ہے:۔

تلک الدار الاٰخرۃ نجعلھا	"یہ دار آخرت ہم اُن لوگوں کو عطا
للذین لا یریدون علواً	کرینگے جو دُنیا میں اونچا بننا اور
فی الارض ولا فساداً۔	فساد کرنا نہیں چاہتے۔"

اب کس کی ہمت ہے جو اس جاہ و اقتدار کو شرعی مقصود قرار دے؟

لیکن بات ابھی پوری نہیں ہوئی ہے - اس چیز کو ذہن میں مستحضر کر لینا ضروری ہے کہ گفتگو نفس حکومت کے بارے میں نہیں ہو رہی بلکہ حکومت اسلامیہ کے بارے میں ہو رہی ہے اور بحث یہ ہے کہ حکومت اسلامیہ کا قائم کرنا عمل مقصود ہے یا نہیں؟ حکومتِ اسلامیہ کا مفہوم مختصر الفاظ میں "اسلام کی حکومت" یا "قوانین اسلامی" کے اقتدار یا "احکام الٰہیہ کے غلبہ" سے ادا کیا جاسکتا ہے، کیا غلبہ اسلام، بھی مقصود نہیں ہے؟ اور کیا اس کے لئے کوشش کرنا کوئی غیر مقصود عمل قرار دیا جاسکتا ہے؟

مسئلہ کی مزید وضاحت کے لئے چند قدم پیچھے ہٹنا پڑے گا دیکھنا یہ ہے کہ حکومت کی عملی تفسیر کیا ہوتی ہے؟ حکومت خواہ اسلامی ہو یا غیر اسلامی، اگر اصولی ہے تو عملاً کچھ قوانین و احکام کے نفاذ و پابندی سے عبارت ہوتی ہے۔ جمہوری حکومت ان احکام و قوانین کے نفاذ سے عبارت ہے جنھیں جمہور کے نمائندے وضع کرتے ہیں۔ شخصی حکومت ان احکام کے نفاذ کا نام ہے جنھیں شخص وضع کرتا ہے۔ سچ پوچھئے تو اصل حاکم یہی قوانین و احکام ہوتے ہیں اور رعایا انھیں کی اطاعت کرتی ہے وہ اشخاص جو حکام کہلاتے ہیں صرف ان قوانین و احکام کے نفاذ کا ذریعہ ہیں۔ اطاعت احکام کی ہوتی ہے نہ کہ حاکم کی۔ عقلِ سلیم اطاعت حکم کے بغیر اطاعتِ حاکم کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔

حکومت اسلامیہ کا تصور اب بالکل واضح ہو گیا۔ اس کی حقیقت صرف یہی ہو سکتی ہے کہ اسلام کا غلبہ اور اسلامی قوانین کا نفاذ۔ زیادہ واضح الفاظ میں انفرادی زندگی کے علاوہ اجتماعی زندگی پر بھی اسلام کا چھا جانا اور غالب ہو جانا، نیز اسلام کے بعض اجزاء کے بجائے کل اجزاء اسلام کا عملی زندگی میں نمایاں ہو جانا، حق کا باطل پر غلبہ، اسلام کا کفر پر فتح پانا، خیر کا شر کو دبا دینا، اللہ کے کلمہ کی بلندی اور کلمۂ کفر کی پستی، یہ مفہوم ہے اسلامی حکومت کا۔ کیا یہ بھی مقصود نہیں ہے؟

حکومتِ اسلامیہ کی حقیقت تو یہی ہے جس کا تذکرہ ابھی ہوا ہے لیکن ظاہر ہے کہ قوانین خود بخود نافذ ہونے کی طاقت نہیں رکھتے ہیں اس کی تنفیذ کے لئے موزوں و مناسب اشخاص کی ضرورت ہے۔ اسلامی قوانین کی تنفیذ کے لئے مناسب اشخاص وہی ہو سکتے ہیں جو ان سب قوانین پر ایمان رکھتے ہوں اور اسلام کا طوقِ غلامی پہنے ہوئے ہوں۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ نظام حکومت کا مسلمانوں کے ہاتھ میں ہونا حکومت اسلامیہ کے ظہور کا واحد ذریعہ ہے، یا بالفاظ دیگر یہی وہ ہیئت خارجی ہے جو حکومت اسلامیہ کے وجود وظہور کا ذریعہ ہے۔ یہ مقصود ہے یا نہیں؟ اس کا فیصلہ نماز پر ایک نظر ڈال کر کر لیجئے۔ روح صلوٰۃ اظہار عبدیت ہے اور اصل مقصود یہی ہے۔ اس کی ظاہری ہیئت یعنی رکوع، سجود، قیام، اگرچہ اس روح سے خالی ہو کر بے جان و بے فائدہ ہو جاتے ہیں مگر چونکہ اس روح و مقصود کے ظہور و وجود کا تنہا ذریعہ ہیں اس لئے شرعاً وہ بھی مقصود ہیں، کوئی نماز بغیر ان ظاہری ہیئتوں کے وجود میں نہیں آسکتی نہ قابل قبول ہو سکتی ہے۔ اسی آئینہ میں حکومت کی صورت بھی ملاحظہ فرمالیجئے۔ جو چیز ایک مقصود یعنی اسلامی احکام کے نفاذ اور ان کے ظہور کا واحد ذریعہ ہے وہ غیر مقصود کس طرح قرار پاسکتی ہے؟ اور اس کی مقصودیت میں کلام کی کیا گنجائش باقی رہ جاتی ہے؟

کچھ غلط فہمیاں بھی اس مغالطہ کا سبب ہیں۔ بعض حضرات یہ سمجھتے ہیں کہ اسلامی حکومت کا تعلق محض "ارتفاقات" نہ کہ "اقترابات" ہے۔ اس کا کام فقط اتنا ہے کہ ظلم کی جگہ عدل کو دلائے اور ایسے قوانین کا نفاذ کرلے جن کا تعلق دنیا سے ہے، جیسے حدود، قصاص وغیرہ۔ ان سب امور کا اولین تعلق دنیاوی مصلحتوں سے ہے اور یہ دین میں داخل نہیں ہیں۔ اس لئے انھیں مقصود قرار دینا غیر دین کو دین میں داخل کرنا ہے۔

جواب کی ابتداء ہم اسی مفروضہ سے کرتے ہیں کہ حکومت کا تعلق انھیں مذکورہ امور سے ہے۔ لیکن ہم کسی طرح اس پر مجبور نہیں ہیں کہ انھیں دین سے خارج کر دیں۔ بلکہ انھیں داخلِ دین سمجھنے پر مجبور ہیں خود قرآن مجید انھیں دین کہہ رہا ہے:-

ما کان لیأخذ اخاہ فی دین الملک۔ (یوسف) (حضرت یوسفؑ "اپنے بھائی کو شاہی قانون کے مطابق نہیں لے سکتے تھے")

وہ شاہی قانون سرقہ کے متعلق تھا اسے "دین الملک" فرمایا گیا ہے۔ اگر قانون سرقہ یا اسی قسم کا اور کوئی قانون اللہ تعالیٰ کا بنایا ہوا ہوتو اُسے "دین اللہ" کیوں نہ کہا جائے گا؟ ان احکام سے بعض دُنیاوی مصلحتوں کا حاصل ہونا یا ان کا کسی درجہ میں مقصود ہونا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ ان سے آخرت مقصود ہی نہیں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ کل احکام اسلامیہ سے مقصود آخرت ہی ہے اور دُنیاوی مصلحتیں بھی ضمنی طور پر بعض احکام کا مقصد بنائی گئی ہیں۔ لیکن وہ مصلحتیں بھی دراصل بالواسطہ اُخروی مصلحتوں کے حاصل ہونے میں معاون ہیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ارتفاقات بھی درحقیقت اقترابات ہیں۔ صرف صورت کے فرق نے "عبادات" کو دو حصّوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ یہ اصطلاحیں صرف سہولتِ بیان کے لئے اختیار کی گئی ہیں، نہ کہ دونوں چیزوں میں افتراق کامل پیدا کرنے کے لئے۔ حج بیت اللہ ایک رکنِ اسلام ہے۔ لیکن اس کا ایک مقصود یہ بیان فرمایا:-

"لیشھدوا منافع لھم" "تاکہ اپنے (دینی و دُنیوی) فائدوں کے لئے آموجود ہوں"۔

عام طور پر مفسرین نے منافع سے دُنیا و آخرت دونوں کے منافع مراد لئے ہیں۔ تفسیر کبیر میں تو ایک ہی قول لکھا ہے۔ لیکن صاحب روح المعانی نے ایک قول یہ بھی لکھا ہے کہ منافع آخرت مُراد ہیں مگر آخر میں پہلے ہی قول کو ترجیح دی ہے اور لفظ "شھود" نیز تنکیر منافع یہ دونوں چیزیں وضاحت طور پر بتا رہی ہیں کہ دُنیا و آخرت دونوں کی منفعتیں مراد ہیں ان دُنیاوی مقاصد کے باوجود حج ارکانِ دین ہی ہے۔

نکاح کے مقاصد بھی دنیوی و اُخروی دونوں قسم کے ہیں، ایک منصوص دُنیاوی مقصد مُلاحظہ ہو:-

ومن اٰیاتہ ان خلق لکم من انفسکم ازواجاً لتسکنوا الیھا۔ "اور اُس کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ اُس نے تمہیں میں سے تمہارے لئے بیویاں پیدا کیں تاکہ اُن سے سکون حاصل کرو"۔

باوجود اس کے نکاح کو "سنت" قرار دے کر دین میں داخل فرمایا گیا ہے اور اس سے بے رغبتی پر:-

فمن رغب عن سنتی فلیس منی۔ (مشکوٰۃ) "جو میری سنت سے بے رغبتی برتے وہ میری جماعت سے خارج ہے"

کی وعید ہے۔

اپنی بیوی کے مُنہ میں "لقمہ دینا" ایک خالص معاشرتی چیز ہے۔ لیکن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے "صدقہ" فرمایا ہے جس کے متعلق یہ بتانا غیر ضروری ہے کہ وہ ایک دینی عمل ہے۔

دین میں اس قسم کی مثالیں ایک دو نہیں بکثرت پائی جاتی ہیں۔ یہ مثالیں اس حقیقت پر روشنی ڈالتی ہیں کہ شریعت اسلامیہ نے دین و دُنیا میں ایسا حکیمانہ اور بے نظیر امتزاج پیدا کیا ہے جو دُنیا کو دین کا تابع اور "مزرعۃ الآخرۃ" بنا کر پوری انسانی زندگی کو عبادت بنا دیتا ہے۔ زندگی کی یہ متعارف تقسیم جس سے دُنیا و دین کے دو خانے الگ الگ بنتے ہیں اسلامی نقطۂ نظر سے صحیح نہیں قرار دی جا سکتی۔ اس روشن حقیقت کو پیش کرنے کا سہرا تو صرف اسلام ہی کے سر ہے کہ انسان صرف عبادت کے لئے پیدا کیا گیا ہے اور اس کی پوری زندگی آخرت کے لئے ہے، اُس کی ہر سانس عبادت بن سکتی ہے بشرطیکہ وہ اسلامی طریق حرکت اختیار کرے، اور عبادت احکام ربّ العالمین کی تعمیل سے عبارت ہے نہ کہ صرف چند رسمی اشکال و ہیئیات کو اختیار کرنے سے۔

مومن کا نعرہ:-

انّ صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ ربّ العٰلمین۔ "بیشک میری نماز میری عبادت میری زندگی اور میری موت سب اللہ ربّ العالمین کے لئے ہے"

ہوتا ہے۔ اس کی زندگی کا کوئی حصّہ خالصۃً دُنیا کے لئے کیوں کر ہو سکتا ہے؟

حدود، قصاص، امامۃ، امن و امان، معاشی اصلاحات وغیرہ وہ احکام جن کے ساتھ حکومت و سلطنت کا خصوصی رابطہ ہے، سب کے سب دین میں داخل ہیں، وہاں پر عمل کرنا اجتماعی عبادت ہے۔ ان سے بعض مصالح دُنیا کا حاصل ہونا انھیں دینی

ہرگز خارج نہیں کر سکتا۔

لیکن یہ تو ایک فرضی بات تھی کہ سلطنت و حکومت کا تعلق صرف انھیں احکام سے ہے۔ کتاب و سنت سے دریافت کیجئے کہ حکومت کے فرائض کیا ہیں اور اس کا رشتہ زندگی کے کتنے شعبوں سے جڑا ہوا ہے؟ :-

الذین ان مکنّاھم فی الارض اقاموا الصلوٰة واٰتوا الزکوٰة وامروا بالمعروف ونھوا عن المنکر۔	"یہ لوگ ایسے ہیں، کہ اگر ہم انھیں زمین میں اقتدار عطا کر دیں تو یہ نماز قائم کریں گے زکوٰۃ دیں گے اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کریں گے"

لیجئے خود قرآن مجید نے حکومت کا رشتہ اقامت صلوٰۃ و ایتاء زکوٰۃ کے ساتھ قائم کر دیا۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا آغوش تو شریعت کے ہر حکم کے لئے ہوا ہے۔ عقائد، عبادات، معاشرت، معاملات سیاسیات، معاشیات وغیرہ زندگی کا ہر شعبہ اور شریعت کا ہر حصہ حکومت سے مربوط نظر آتا ہے۔ مستثنیٰ صرف وہ امور کرنے پڑیں گے جو حکومت کی دسترس سے باہر اور اس کی نظر سے کلیۃً اوجھل ہوں۔

اب سلطان دو عالم کے طرزِ عمل کی طرف آیئے۔ نمازوں کا انتظام حج کا اہتمام، اخلاق کی اصلاح، معاملات کی نگرانی، معاشرت کی درستگی؛ ان میں سے کونسی چیز ایسی ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی توجہات عالیہ کی احسان مند نہ ہو؟ خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کا طرزِ عمل بھی اس بارے میں پوشیدہ نہیں ہے، نماز کے بارے میں فاروقِ اعظم کا مشہور فرمان تو بعض مسائل فقہیہ کے لئے سند ہے اس دور کے بعد جو صالح خلفاء و سلاطین گذرے ہیں انھوں نے بھی حکومت کی اس جامعیت کو نباہا۔ فقہاء نے تو مسئلہ کو اور بھی صاف کر دیا ہے۔

بات پوری نہ ہوگی اگر ایک شبہ کا ازالہ نہ کر دیا جائے متعدد احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکومت اور عہدوں کی طلب سے ممانعت فرمائی ہے۔ بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرام میں سے بعض نے کسی عہدے کی خواہش کا اظہار کیا تو آنحضورؐ نے اس فعل سے انھیں روکا اور نہ صرف روکا، بلکہ انھیں اس عہدے سے محروم بھی کر دیا۔ سوال یہ ہے کہ اگر اسلامی حکومت قائم کرنا ایک ایسا کام ہے جو مقصود ہے تو اس کی خواہش اور طلب سے کیوں روکا گیا؟ اور جب ذاتی طور پر اپنے لئے حکومت و امارت کی طلب ناجائز ہے تو کسی اپنی جماعت اور پارٹی یا اپنی قوم کے لئے ان کی طلب کیوں جائز ہوگی؟

ایک بزرگ نے مجھ سے اس شبہ کا اظہار فرمایا اس لئے میں نے اس کا مستقل تذکرہ کر دیا۔ ورنہ گذشتہ صفحات میں غور کرنے سے یہ شبہ خود بخود دور ہو جاتا ہے۔ مزید تسکین کے لئے دو لفظ اور سن لیجئے :- پہلی اصولی بات تو یہ ہے کہ انفرادی احکام پر اجتماعی احکام کو قیاس کرنا صحیح نہیں ہے۔ بسا اوقات ایک کام اپنی ذات کے لئے ناجائز ہوتا ہے لیکن جماعت کے لئے جائز بلکہ بعض صورتوں میں واجب ہو جاتا ہے۔ مثلاً نماز میں امامت کی خواہش و کوشش، انفرادی طور پر مذموم ہے لیکن یہ خواہش اور کوشش کہ اچھے لوگوں میں سے کسی کو امام بنایا جائے یا کسی دوسرے صالح شخص کے لئے کوشش کرنا نہ صرف مستحب بلکہ بعض صورتوں میں واجب ہے اِس اصول کو سامنے رکھئے تو یہ شبہ سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتا اقامتِ حکومت اسلامیہ کو شریعت ایک عمل مقصود قرار دیتی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اسلامی اصول و احکام کا غلبہ ہو، اور نظام صالح مسلمانوں کے ہاتھوں میں ہو۔ اس کے معنی کسی خاص مسلمان کے ذاتی اقتدار کے ہرگز نہیں ہیں۔ جب کوئی شخص کسی صالح جماعت کے لئے اس اقتدار کا طالب ہوتا ہے تو وہ درحقیقت اصول اسلامی کا اقتدار چاہتا ہے جو عین مقصود ہے۔ لیکن اپنی ذات کے لئے عہدے کا طالب ذاتی اقتدار چاہتا ہے جو شرعاً اور عقلاً ہر طرح مذموم اور ممنوع ہے۔ اسلام جس چیز کو ایک عمل مقصود قرار دے رہا ہے اُس سے روکتا کب ہے؟ اور جس چیز سے روکتا ہے وہ مقصود کہاں ہے؟

ذاتی اور انفرادی طور پر عہدے اور اقتدار کی خواہش کو ہر صورت میں ناجائز سمجھنا بھی صحیح نہیں۔ فقہ کی کتابوں میں یہ مسئلہ دیکھا

جاسکتا ہے کہ اگر کوئی شخص دیانتداری کے ساتھ خود کو کسی اسلامی حکومت کے کسی عہدے کے لئے موزوں تر سمجھتا ہو اور ذاتی اقتدار یا دولت کے لئے نہیں بلکہ محض خدمت دین اور تحصیل رضاء الٰہی کے مقصد سے اسے حاصل کرنے کی جائز طریقہ سے کوشش کرے تو اس کا یہ فعل نہ صرف جائز بلکہ مستحسن ہوگا یہاں تک کہ بعض صورتوں میں اس کوشش کو واجب قرار دیا جاسکتا ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس حکم کا مدار عہدہ طلب کرنیوالے کی انفرادی یا اجتماعی حیثیت پر نہیں ہے، بلکہ اصل مدار اخلاص اور اس کے فقدان پر ہے چوں کہ اپنی ذات کے لئے اقتدار کی طلب عام طور سے اخلاص و للہیت پر مبنی نہیں ہوتی بلکہ نفسانیت پر مبنی ہوتی ہے اس لئے اس کی ممانعت فرمائی گئی۔ اور کسی صالح جماعت کے لئے اس کی طلب عموماً مخلصانہ ہوتی ہے اس لئے اس سے نہیں روکا گیا۔ اگر جماعت کے لئے حکومت و اقتدار کی خواہش دینی اور مخلصانہ جذبات کے بجائے غیر اسلامی جذبات و محرکات سے پیدا ہو تو اس کے مذموم ہونے میں بھی کوئی کلام نہیں ہوسکتا۔ خاندانی، وطنی یا قومی یا اسی قسم کے اور کسی جاہلی حمیت کی بناء پر کسی جماعت کو برسر اقتدار لانے کی کوشش اس طرح ناجائز ہے، جس طرح ذاتی اقتدار حاصل کرنے کی کوشش۔

یہاں اس اصولی بات کو پیش نظر رکھنا بھی ضروری اور مفید ہے کہ زیر بحث شبہ کی حیثیت محض ایک شبہ کی ہے نہ کہ دلیل کی۔ شبہ کا حاصل یہ ہے کہ زیر بحث مسئلہ میں شرعی دلائل کے درمیان تعارض معلوم ہوتا ہے۔ اوپر کی سطروں میں اس تعارض کو دفع کردیا گیا ہے۔ لیکن اگر یہ شبہ نہ بھی دور ہوتا تو بھی اسے اقامت حکومت اسلامیہ کو غیر مقصود سمجھنے کی دلیل بنانا اور کتاب و سنت سے جو دلائل اس دعوے پر پیش کئے جاچکے ہیں ان سب کو اس سے منسوخ سمجھنا تو کسی طرح صحیح اور فقیہانہ استدلال نہیں سمجھا جاسکتا۔

نتائج نیچے کی سطروں میں پوری بحث کے نتائج ذکر کئے جاتے ہیں۔ تاکہ آسانی کے ساتھ انھیں محفوظ رکھا جاسکے۔

(۱) اگر استطاعت حاصل ہو تو اسلامی حکومت قائم کرنا سب مسلمانوں پر واجب علی الکفایہ ہے، یہ مسلک کتاب سنت اور اجماع امت سے ثابت ہے اور نفس وجوب کے اعتبار سے اس میں اور نماز میں کوئی فرق نہیں ہے، فرق جو کچھ ہے وہ افضلیت و مفضولیت کا یعنی فرض نماز اس سے افضل ہے۔

(۲) خلافت اسلامیہ کا قائم کرنا اور اسی قسم کے دوسرے سیاسی مسائل نہ تو کل دین ہیں نہ دین سے خارج، ان میں ایمانیات کے برابر درجہ دینا بھی غلطی ہے اور دنیاوی کام سمجھنا بھی غلطی ہے صحیح مسلک یہ ہے کہ یہ بھی دین کا ایک شعبہ اور اس کا ایک حصہ ہے

(۳) اقامت حکومت ایک عمل مقصود ہے۔ غیر مقصود ہرگز نہیں ہے اس کی جگہ نماز، روزے کی صف میں ہے نہ کہ وضو و تیمم کی صف میں۔ نفل عبادت سے اس کا درجہ بہت بلند ہے۔ نفل نماز روزہ یا حج وغیرہ کو ہرگز اس کے برابر درجہ نہیں دیا جاسکتا۔

(۴) اس مقصد کے لئے کوشش کرنا اور اس کی دعوت دینا ایک قسم کی عبادت اور حق تعالےٰ کے قرب اور اس کی رضا کا سبب ہے جو بعض صورتوں میں مستحب اور بعض میں واجب ہوتی ہے باوجود استطاعت و ضرورت اس سے پہلوتہی کرنا معصیت اور حق تعالےٰ کے غضب کا سبب ہے۔ جب یہ واجب ہو تو نفل نماز یا کوئی دوسری نفل عبادت ہرگز اس کے برابر نہیں ہوسکتی۔

(۵) اس کے لئے کوشش کے یہ معنی ہیں کہ جو اعمال صالحہ اس کے ساتھ مناسبت رکھتے ہوں اور عادۃً اس کے ذرائع بنتے ہوں انہیں اختیار کیا جائے مثلاً اس نظریہ کی اشاعت کرکے لوگوں کو ہمخیال بنانے کی کوشش کرنا یا منظم کرنا وغیرہ۔ اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ انفرادی اعمال کی کثرت یا اصلاح سے براہ راست ہم اس مقصد کو حاصل کرنے کی کوشش کریں۔

پورا مضمون پڑھنے کے بعد اس سوال کی طرف بھی ذہن خود بخود پہونچتا ہے کہ اس زمانہ میں خلافت اسلامیہ قائم کرنے کی کوشش کرنا مناسب ہو یا نہیں؟ اور دونوں صورتوں میں کہاں مناسب ہے اور کہاں نامناسب؟ لیکن مسئلہ اس دباتی

(باقی آخر صفحہ پر)

گیارھویں قسط:-

تذکرہ اُدبائے دارالعلوم دیوبند

(از محمد انوار الحسن انور شیرکوٹی پروفیسر اسلامیہ کالج لائلپور)

حضرت مولانا نانوتویؒ کی اُردو انشاء نگاری:-

گذشتہ مضمون میں حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ بانی دارالعلوم دیوبند کی ادبیات کے سلسلہ میں آپ کی تقریر پر سیر حاصل تبصرہ کیا گیا ہے جس میں آں ممدوح کے فنِ خطابت پر نہ صرف مسلمانوں بلکہ غیر مسلم افراد کے تبصروں سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ اب ادبیاتِ قاسمی کے سلسلہ کی کڑیوں میں حضرت قاسم العلوم کی اُردو نثر نگاری پر راقم الحروف کو قارئین کے سامنے چند حقائق پیش کرنے ہیں جن سے آپ کی نثر نگاری کا پورا خاکہ ادب کی دُنیا میں کھنچ سکے گا۔

مولانا کی نثر نگاری کو اگر دو حصوں میں تقسیم کیا جائے تو نہایت مُناسب ہوگا۔

پہلا حصہ نثر کے ان جواہر پاروں سے وابستہ ہے، جو مولانا کے مکتوبات میں چمکتے ہوئے پائے جاتے ہیں۔ ان نثری تحریروں سے حضرت امام الامت کے اُس کمال پر روشنی پڑتی ہے جس کی طرف ادب نواز طبیعتوں نے آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ حالانکہ حضرت قاسم العلوم کی عالمانہ اور مصلحانہ شان سے علیحدہ ہٹ کر آپ کے مکتوبات اور خطوط کی ادبی قدروں کو دیکھا جائے تو ان میں ادب کے وہ خاص خاص تابناک اور روشن جواہر پارے ملیں گے جن کو دیکھ کر آنکھیں منور ہو جاتی ہیں، یہی وہ ادبی قدریں ہیں جنہوں نے غالب کو ادبائے اُردو کی نظروں میں بلند مقام بخشا ہے یعنی غالب کے اُردو خطوط کا وہ انفرادی رنگ جس کا وہ خود موجد تھا اور جس کو دُنیا سے وہ اپنے ساتھ لے گیا۔

حضرت قاسم العلوم کے رُوحانی و علمی کمالات کا غالب سے تقابل کرنا تو کوئی معنی ہی نہیں رکھتا اور نہ ان اوصاف میں قدروں کا اشتراک ہی ہے، البتہ ادبی کمالات کا غالب سے انکار دُشوار ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ وہ اردو نثر و نظم، انشاء نگاری اور فارسی نثر و نظم کا امام تھا۔ اس کی نثر و نظم، اُردو نیز فارسی پر بیسیوں دماغوں نے تنقید کی ہے بالخصوص حالی نے "یادگارِ غالب" لکھ کر اولین کوشش (First Attempt) کی طرف قدم بڑھایا ہے۔ پانی پت کے اس مصنف نے غالب کے خطوط اور اس کے صفات پر جو روشنی ڈالی ہے اس میں ایک سب سے بڑی خُوبی یہ بیان کی ہے کہ مرزا کے خطوط کی طرز ایسی ہے گویا کوئی شخص سامنے بیٹھا ہے اور رُوبرو باتیں ہو رہی ہیں۔ ان کے خطوط میں ڈرامائی انداز بھی ہے اور ظرافت بھی، وہ آداب و القاب کو مختصر الفاظ میں پیش کرتے ہیں اور قدیم اندازِ طولانی سے بیزار ہیں بلکہ بعض اوقات القاب و آداب کو بھی بالائے طاق رکھ کر اظہارِ مدعا پر قلم اُٹھاتے نظر آتے ہیں۔ کبھی وہ مکتوب الیہ کو غائب فرض کر لیتے ہیں، اور سب سے بڑی خوبی ان کے اندازِ تحریر میں سادگی اور بے تکلفی ہے۔ جو دل میں آتا ہے بے ساختہ لکھتے جاتے ہیں اور الفاظ بے تکلفی کے سانچے میں ڈھلتے چلے جاتے ہیں۔

خطوط میں بے ساختگی

مکتوبات میں ایک سب سے بڑی خُوبی جو اُن کی رُوح ہوتی ہے وہ بے تکلفی، اور سادگی ہے جس کا ابھی ذکر ہوا ہے، اس سادگی اور بے ساختگی کی وجہ صرف یہ ہے کہ مراسلہ نگار خط لکھتے وقت اپنے ماحول سے فراموشی اختیار کر کے مکتوب الیہ کے تعلقات اور خیالات میں، درآں حالیکہ وہ مکتوب الیہ بے تکلف دوست یا عزیز ہو، ایسا گم ہوتا ہے کہ اپنی زندگی اور اس کی کیفیت کا نقشہ نہایت بے ساختگی میں کھینچ کر

رکھ دیتا ہے۔ مکتوب نگار کو قطعاً علم نہیں ہوتا کہ اس کے یہ ذاتی خطوط اوروں کی نظروں کے سامنے سے بھی گذریں گے۔ اگر مکتوب نگار کو یہ علم ہوجائے تو یقیناً اُس کی خط نویسی میں ایک احتیاط کا جذبہ کارفرما نظر آئیگا اور جب احتیاط پیش نظر ہوگی تو تحریر میں بیساختگی کی بجائے تکلف اور جھجک پیدا ہوجائیگی اور یہی احتیاط خطوط نویسی کی اصلی سادگی اور بے تکلفی کو برباد کرکے رکھدیگی نیز مکتوب نگار کی طبیعت کا وہ اصلی جوہر ماند پڑجائیگا جو اس عالم بیخودی میں ظہور پذیر ہوتا ہے اور اس خیال کے ماتحت جلوہ نما ہوتا ہے کہ اس کے یہ خطوط نجی خطوط ہیں اور ان پر کسی دوسرے کی نگاہ نہیں پڑے گی۔ ان دونوں خیالات کا واضح اثر خط نویسی پر آپ دیکھ سکتے ہیں۔ تنقید اور بدگمانی برطرف مولٰنا شبلیؒ ایک انسان تھے جن کے سینہ میں یقیناً ایک حساس دل تھا اُن کے وہ خطوط جو انہوں نے اپنے شاگرد رشید عطیہ فیضی کو لکھے ہیں، ان خطوط سے یقیناً مختلف ہیں جو شبلی مرحوم نے اپنے دیگر تلامذہ یا احباب اور معاصرین کو لکھے ہیں۔ اگر شبلی کو یہ علم ہوجاتا کہ میرے یہ خطوط طبع ہوکر منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوں گے، اور خلائق کی ضیافت طبع کا سامان بنیں گے تو شبلی کبھی وہ رنگ اختیار نہ کرتے اور اُن کی طبیعت کا اصلی جوہر کبھی نہ کھُلتا۔ غالبؔ نے اپنے شعر میں اسی حقیقت سے پردہ اُٹھایا ہے ؎

کھُلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

مولٰنا ابوالکلام آزاد انشا نگاری میں یقیناً اپنے رنگ میں فرد ہیں اور حقیقت بھی یہی ہے کہ محمد حسین آزاد اور ابوالکلام آزاد دونوں حضرات نے اُردو انشاء نگاری میں وہ گل مہکائے ہیں کہ جن کی خوشبو دماغوں سے کبھی نکل نہ سکے گی۔ اول الذکر مولٰنا آزاد نے جو خطوط احمد آباد کی جیل سے لکھے ہیں اور جو "غبارِ خاطر" کے عنوان سے کتاب کی شکل میں مفرحِ دل و دماغ ہیں، وہ بیساختگی اور آمد کا بہترین مُرقع ہیں، اور آزاد کے دل کی گہرائیوں کے آئینہ دار ہیں۔

حضرت نانوتویؒ کے خطوط

بہرحال اس حقیقت کے باوجود کہ غالبؔ نے خط نویسی کا جو انداز متعین کیا ہے وہ اُن کا بلا شرکت غیرے انفرادی اور امتیازی رنگ ہے۔ مجھے یہ دیکھکر حیرانی ہوئی ہے کہ حضرت قاسم العلوم رحمۃ اللہ علیہ کا طرزِ خط نگاری یا مکتوب نویسی بلا تصنع و تکلف غالبؔ سے بہت کچھ ملتا جلتا ہے۔ راقم الحروف کا خیال ہے کہ غالبؔ کے اندازِ نگارش کا عکس حضرت مولٰنا محمد قاسم صاحبؒ کے نہ صرف اُردو خطوط میں بلکہ فارسی نثروں میں بھی جھلکتا نظر آتا ہے اور اگر قاری غور کرے تو اُس کو میرے ساتھ اتفاق کرنے کا خیال پیدا ہوجائے بلکہ یقین کے قریب آجائے کہ واقعی اب تک یہ حقیقت آنکھوں سے اوجھل رہی۔

حیرت پر حیرت اور افسوس پر افسوس ہوتا ہے کہ علماء دیوبند نے نہ صرف شریعت اسلامیہ کی خدمت کی ہے بلکہ اگر ریسرچ اور تحقیق کی دُنیا میں اگر سوچا جائے تو معلوم ہوگا کہ انہوں نے اُردو ادب کی شاندار خدمات انجام دی ہیں لیکن آج جبکہ اُردو ادب کے ایک ایک گوشے پر نظر ڈالی گئی ہے، اور تحقیقات کی دُنیا کو کھنگال کر رکھدیا گیا ہے، علمائے دیوبند کی اُردو خدمات سے اہل نقد و نظر کا چشم پوشی اختیار کرنا سمجھ میں نہیں آتا۔

غالباً جنوری ۱۹۵۲ء کی بات ہے کہ راقم الحروف نے حلقۂ ارباب علم لاہور کے ایک اجلاس منعقدہ وائی۔ ایم۔ سی میں جدید تعلیم یافتہ طبقے کے سامنے حضرت مولٰنا محمد قاسم صاحب علیہ الرحمۃ پر مقالہ پڑھتے ہوئے ان کی اُردو خطوط نویسی کے سلسلہ میں غالبؔ کے اندازِ نگارش سے ہم آہنگی کا ذکر کیا تھا اور حضرت قاسم العلوم کے بعض خطوط کی عبارتوں کو نمونے میں پیش کیا تھا۔ چنانچہ اس تنقیدی مجلس علم و ادب میں میرے اس خیال کی کسی نے تردید نہیں کی تھی۔ میں نے اس خاموشی کا یقیناً یہ نتیجہ نکالا تھا کہ حلقۂ ارباب علم کے ادب پسند طبقے نے مولٰنا کے خطوط کی طرزِ نگارش میں غالبؔ کا رنگ جھلکتا دیکھا ہے جو یقیناً اردو ادب کا بہترین سرمایہ سمجھا گیا ہے۔ میں قاری کو زیادہ دیر تک انتظار میں رکھنا پسند نہیں کرتا۔ بلکہ ان کے اُردو خطوط پیش کرکے غالبؔ سے ہم آہنگی پر سیر حاصل تبصرہ کرتا ہوں، اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ دار العلوم دیوبند کا یہ موسس، بوریا نشیں درویش کس بلا کا فصیح و بلیغ انشاء پرداز تھا۔ لیکن حضرت کے خطوط سے قدرے تعارف کراؤں تو پھر آگے چلوں:۔

حضرت قاسم العلومؒ کے مکاتیب

یوں تو حضرت قاسم العلوم کے مکاتیب مختلف

تصنیفی شکلوں میں جُدا جُدا ملیں گے جن کو یکجا کرنے کی ضرورت ہے۔ مثلاً سرسید کے نام بوساطت پیرجی محمد عارف صاحب ایک خط ہے اور دوسرا خط بلا واسطہ ہے، یہ دونوں خط "تصفیۃ العقائد" کے نام سے ۲۷ ستائیس صفحات تک چلے گئے ہیں اور رسالہ کی شکل میں ہیں۔ اسی طرح مولوی جمال الدین صاحب دہلوی کے نام تحقیق مسئلہ "وحدۃ الوجود" پر ایک خط ہے، اور دوسرا مکتوب "سماع موتیٰ" کے متعلق ہے یہ دونوں مکتوب بھی ۱۷ سترہ صفحات میں "جمال قاسمی" کے نام سے طبع شدہ ہیں۔ بعض اور خطوط بھی ہیں جو رسالوں کی شکل میں چھپے ہوئے ہیں اور جو جامعہ ملیہ دہلی کے کتب خانہ میں موجود ہیں جن میں بعض احادیث و آثار نبوی صلعم کی تحقیقات کی گئی ہے مثلاً مولوی محی الدین احمد خانصاحب کو ایک فارسی خط میں جو پورا ایک رسالہ ہے اور جو مفتی حسین احمد صاحب کے پیام پر لکھا گیا ہے۔

حدیث رزین قال قلت یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم این کان ربنا قبل ان یخلق خلقہ قال کان فی عماء ما تحتہ ھواء وما فوقہ ھواء وخلق عرشہ علی الماء' کی شرح اور وضاحت مولانا محمد قاسم صاحب نے تحریر فرمائی ہے۔ اصل میں مولٰنا کے اور کئی مکتوبات ہیں جو "قاسم العلوم" میں درج ہیں جس کے چار نمبر ہیں اور سب ایک ہی جلد میں یکجا ہیں اور جو جامعہ ملیہ کے کتب خانہ میں ہیں جس کا نمبر قاسم العلوم $\frac{۲۸۲}{۴۵۴}$ ق ہے، ان نمبروں میں سے پہلا قاسم العلوم نمبر بیت الحکمۃ جامعہ نگر دہلی نے ۲۱ر اگست ۱۹۴۱ء، مطابق ۲۷ر رجب ۱۳۶۰ھ میں مطبع مجتبائی دہلی کے ایک نسخہ مطبوعہ ۱۵ر ربیع الاول ۱۲۹۲ھ سے نقل کر کے چھاپا ہے۔ جس میں ترمذی کی مذکورہ حدیث ابی رزین کی شرح ہے۔

علاوہ ازیں حضرت نانوتویؒ کے پندرہ خطوط یکجا چھپے ہوئے ہیں جو "فیوض قاسمیہ" کے نام سے معنون ہیں۔ اس مجموعہ میں نو فارسی خطوط ہیں اور چھ اُردو کے خط ہیں۔ لیکن دل کے لئے یہ امر حسرت انگیز ہے کہ حضرت کے کتنے ایک خطوط لوگوں کی غفلت سے ضائع ہو گئے مثلاً مولوی جمال الدین صاحب دہلوی جمال قاسمی کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:۔

"اخلاص آئین فقیر مسکین محمد جمال الدین دہلوی علوی تجاوز اللہ تعالیٰ عن ذنبہ الجلی والخفی عرض کرتا ہے کہ طالب علمی کے زمانے میں ایک مخلص محب بزرگ مشفق برگزیدہ مولوی حافظ حاجی محمد قاسم صاحب صدیقی نانوتوی چشتی مرحوم زمانہ کے امام حدیث ہونے کے سوا ر تصوف میں صوفی صافی۔ فقیر کے نام جو خطوط ان کے لکھے ہوئے تھے اُن کی موجودگی کی استغنائی سے بے احتیاطی نے تلف کر دیئے۔" (دیباچہ جمال قاسمی صلہ)

اس عبارت کے آخری جملے سے معلوم ہوا کہ حضرت قاسم العلومؒ کے کتنے ایک خطوط اُن کی بے احتیاطی کا شکار ہو گئے، جمال قاسمی کے دیباچے سے یہ بھی معلوم ہوا کہ امام شریعت نے علم ہندسہ، ہیئت، فلاحت، جبر و مقابلہ جر ثقیل جیسے علوم پر بھی قلم اٹھانے کا ارادہ فرمایا تھا مگر مولوی جمال الدین صاحب نے ہر مضمون پر ایک ایک ورق لکھنے کی قید لگادی اور حضرت قدس سرہٗ نے اس قید سے گھبراہٹ اور اضطراب کا اظہار فرمایا۔ چنانچہ مولوی جمال الدین صاحب لکھتے ہیں:۔

"آخر سو رسائل ہندسہ، ہیئت، فلاحت، طبیعی، جبر و مقابلہ، جر ثقیل وغیرہا علوم میں ایک ایک ورق میں لکھنے کی فرمائش کی، بار بار تقریباً چھ مہینے تک مولوی صاحب اصرار کئے گئے، کہ ہر رسالہ کی ایک ایک ورق کی قید نہ لگایئے کیوں کہ میں قلم کے ہاتھ سے لاچار ہوں۔ فقیر نے اس سبب سے کہ یہ یادگار ضرور کم از کم سو جز سے بڑھ جائے گی تو بوجہ اپنی بے سروسامانی کے چھپنے سے رہ جائے گی قلم کے اختیار کی رخصت نہ دی، اس باعث یہ کام ناتمام رہا۔" (جمال قاسمی صلہ)

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت قاسم العلوم کا ارادہ ان تمام مذکورہ علوم پر سیر حاصل بحث کرنے کا تھا۔ لیکن مولوی جمال الدین صاحب نے اپنے عذر کے باعث اُمت مسلمہ پر ظلم کیا ہے کہ حضرت کے قلم سے مذکورہ علوم کی تحقیقات کا خزانہ ہم تک پہنچنے سے ضائع کر دیا۔ خدا جانے کیا کیا تحقیقات کے دریا اُن خطوط میں امام ملت بہاتے۔ جن سے

قلوب ملت کی کھیتیاں لہلہا اُٹھتیں مگر افسوس اُن علوم کی تحقیقات سے ہماری قسمت میں محرومی لکھی تھی۔ درانحالیکہ حضرت حاجی امداداللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے وہ الفاظ جو حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ نے سوانح قاسمی میں درج فرمائے ہیں ابھی تک ہمارے کانوں میں گونج رہے ہیں :۔

"حضرت حاجی صاحبؒ نے فرمایا کہ مولوی (محمد قاسم) صاحب کی تحریر و تقریر کو محفوظ رکھا کرو اور غنیمت جانو۔"

(سوانح قاسمی ص ۱۴-۱۵)

اور یہ جملہ بھی حضرت حاجی صاحب نے فرمایا تھا کہ "ایسے لوگ (یعنی مولانا محمد قاسم صاحب جیسے) کبھی پہلے زمانہ میں ہوا کرتے تھے۔ اب مدتوں سے نہیں ہوتے۔" (سوانح قاسمی ص ۱۴)

حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی اس آگاہی کے باوجود امام ملت مولانا محمد قاسم صاحب قدس اللہ سرہ کی بہت سی تحریریں، تقریریں اور خطوط یقیناً ضائع ہو گئے ہیں۔ آخر وہ خطوط کہاں گئے ہوں گے جو مولانا فخر الحسن صاحب گنگوہیؒ، حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحبؒ حکیم رحیم اللہ صاحب بجنوریؒ ایسے ارشد تلامذہ کو لکھے گئے ہوں گے، دوسری طرف حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے خطوط کا مجموعہ "مکاتیب رشیدیہ" کے نام سے طبع ہو کر آج تک محفوظ چلا آرہا ہے جس سے اہل علم کو آج بھی فیضان پہنچ رہا ہے۔

اسی طرح حضرت حافظ محمد یعقوب صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے مکاتیب جو حضرت نے منشی محمد قاسم صاحب نیانگری کے نام ارسال فرمائے چھپ کر برکات کا باعث بنے ہوئے ہیں لیکن افسوس صد افسوس حضرت قاسم العلوم والخیرات کے چند مکاتیب کے سوائے سب گوشۂ خمول و گمنامی میں پڑ کر ہماری محرومی قسمت کا باعث بن گئے۔ یہ ہے حضرت مرحوم کے خطوط کا تاریخی پس منظر۔

بہرحال حضرت نانوتویؒ کے جن خطوط کا اوپر تذکرہ ہوا ہے میں اب اُن ہی خطوط میں سے قاری کے سامنے اقتباسات پیش کرتا ہوں :۔

ٹونک کی ریاست کے عہدے دار حکیم عبدالصمد صاحب کو ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں :۔

(۱) مکتوب بنام حکیم عبدالصمد صاحب :۔

سراپا عنایت حکیم عبدالصمد صاحب السلام علیکم

ایک ہفتہ گذرا ہو گا کہ آپ کا عنایت نامہ پہنچا تھا مگر امراض خفیفہ کے آمد و شد میں جو اس سال کسی قدر ناتوانی اکثر رہتی ہے کاہلی کے لئے تازہ بہانہ ہو گیا، اس وجہ سے اس دفعہ خطوط کے جواب دشوار معلوم ہوتے ہیں۔ کبھی ہمت کرتا ہوں تو ہفتہ دو ہفتہ کے بعد ایک دو خط کا جواب لکھ دیا ورنہ خیر۔ آج کچھ ہمت کر کے بیٹھا ہوں۔ آپ کے عنایت نامے کا جواب بھی یاد آگیا۔ میری اس کیفیت سے جو عرض کر چکا ہوں خود ظاہر ہے کہ کہیں کے جانے آنے میں اگر طبعی دشواری نہ ہوتی تب بھی اس حال میں دشوار تھا۔ مدت سے احباب دہلی متقاضی ہیں ادھر اپنا شوق بھی ادھر کو کھینچتا ہے، اس لئے یہ ارادہ تھا کہ دیوبند پہنچا تو ادھر سے اُدھر دہلی بھی ہو آؤں گا مگر تواتر امراض کے باعث یہ ارادہ ملتوی رہا۔ اب گو اچھا ہوں مگر کاہلی کے لئے یہ خفیف سی نقاہت کافی ہے غرض ٹونک تک اپنی رسائی کی توقع نہیں، آپ بھی اس خیال کو جانے دیجئے۔ یہیں سے عرض کئے دیتا ہوں کہ اس زمانہ میں یہ توقع بے جا ہے کہ اختلاف اٹھ جائے اور اتفاق پیدا ہو جائے۔ ہاں بالعموم ابناء روزگار میں فہم و انصاف ہوتا تو بعد فہمائش ممکن تھا کہ یہ اختلاف اٹھ جاتے مگر آپ جانتے ہیں کہ آجکل یہ دونوں باتیں نصیب اعداء ہیں۔ یہ اختلاف ہی موجب عداوت ہے اور یہ باہمی عداوت موجب تنفر یک دیگر ہے، اس لئے کوئی کسی کی نہیں سنتا۔ اور بے سمجھے دوسروں کی رسم و راہ کو غلط سمجھتا ہے پھر آپ ہی فرمائیں یہ حال ہو تو کیا حال ہو گا۔ اس صورت میں توقع فہم و انصاف ہو سکتی ہے؟ ہرگز نہیں۔ بلکہ ہر کسی کی خود رائی ہے

مرشدوں کی نسبت یہ خیال غلط ہے کہ وہ ہر دم ساتھ

رہتے ہیں اور ہر دم آگاہ رہتے ہیں یہ خدا ہی کی شان ہے
گاہ و بیگاہ بطور خرق عادت بعض اکابر سے ایسے معاملات
ظاہر ہوئے ہیں اُس سے جاہلوں کو یہ دھوکا پڑا ہے۔ تصور
میں صورت کا خیال امر فضول ہے جیسے کسی کے تذکرہ کے
وقت کسی کا خیال آتا ہے ایسا ہی تصور شیخ میں۔ مگر تصور
کرو تو اپنے آپ کو اپنی جگہ اور شیخ کو اپنے وطن میں۔ اور اسکے
ساتھ یہ خیال رہے کہ اُدھر سے کچھ فیض آتا ہے۔ اللہ الصمد
اور بسم اللہ کو برائے چندے موقوف رکھو اور الصلوٰۃ والسلام
علیک یا رسول اللہ' بہت مختصر ہے۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم کو حاضر و ناظر نہ سمجھنا چاہیے ورنہ اسلام کیا ہوگا
کفر ہوگا۔ بلکہ یوں سمجھیے یہ پیام فرشتے پہنچاتے ہیں۔
والسلام۔ (فیوض قاسمیہ صفحہ ۴۸-۴۹) (محمد قاسم)

مذکورہ بالا خط غور سے پڑھیے اور دیکھیے کہ:-

مکتوب[1] میں کس قدر سادگی اور بے ساختگی[2] ہے۔ غالب کی طرح حضرت قاسم العلوم کے مذکورہ مکتوب میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مکتوب الیہ سامنے ہے اور اس سے بالمشافہہ باتیں ہو رہی ہیں۔ القاب[3] و آداب بالکل مختصر اور غالب کی طرح مختصر ہیں۔ اردو زبان[4] فصیح' صاف اور شگفتہ ہے دل[5] میں جو کچھ ہے وہی زبان قلم پر صاف صاف آئینہ بن کر آ رہا ہے۔

مذکورہ صفات کے باعث قاسم العلوم علیہ الرحمۃ اپنے مکتوب میں غالب کے ہم رنگ نظر آتے ہیں اور حالی کے تبصرہ کی تردید ہوتی ہے' جو انہوں نے "یادگارِ غالب" میں حسب ذیل الفاظ میں کیا ہے۔ حالی مرحوم لکھتے ہیں:-

"مرزا کی اُردو خط و کتابت کا طریقہ فی الواقع سب سے نرالا ہے
نہ مرزا سے پہلے کسی نے خط و کتابت میں یہ رنگ اختیار کیا
اور نہ اُن کے بعد کسی سے اس کی پُوری پُوری تقلید ہو سکی"
(یادگار غالب صفحہ ۱۹۰)

یہی خواجہ حالی دوسری جگہ غالب کے اُردو خطوط کے متعلق لکھتے ہیں:-

"مرزا کی طرزِ تحریر کی جو خصوصیتیں اوپر مذکور ہوئیں یہ کوئی ایسی
چیز نہیں کہ اور لوگ اس کی پیروی نہ کر سکیں مگر وہ چیز
جس نے اُن کے مکاتبات کو ناول اور ڈراما سے زیادہ دلچسپ
بنا دیا ہے وہ شوخیٔ تحریر ہے جو اکتساب مشق و مہارت یا پیروی
و تقلید سے حاصل نہیں ہو سکتی"۔ (یادگار غالب صفحہ ۱۹۵)

خواجہ حالی کی اس دوسری عبارت سے مجھے اتفاق ہے کہ اُردو خطوط نویسی میں غالب کی پیروی ممکن ہے لیکن غالب کی شوخیٔ تحریر کو انہوں نے اپنی تحریر میں اس کا امتیازی ناقابل تقلید طرز ٹھیرایا ہے' یہ ایک درجہ تک ٹھیک ہے۔

راقم الحروف نے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب قدس سرہٗ کو اُردو خطوط نویسی میں جن اوصاف کے باعث غالب کا شریک ٹھیرایا ہے' اُن میں شوخیٔ تحریر کا ذکر نہیں کیا گیا کیوں کہ جس قسم کی شوخیٔ تحریر غالب کے یہاں موجود ہے وہ یقیناً قاسم العلوم کے یہاں ہونی ناممکن ہے کیونکہ آپ کے خطوط کا اکثر موضوع علمی حقائق ہیں' وہاں شوخی کو دخل کہاں ورنہ حقیقت' مجاز اور متانت' شوخی کے رنگ میں بدلکر رہجائیگی' تاہم مولٰنا کے مکاتیب میں بھی ہلکی ظرافت اور ہلکی سی شوخی کی چاشنی موجود ہے جس کو آپ کے فارسی خطوط میں انشاء اللہ پیش کرونگا

قاسم العلوم کی خط نویسی میں غالب کا رنگ دیکھنے کے لئے اب میں مرزا کا ایک خط پیش کرتا ہوں جس سے باہمی قدروں کے اشتراک کا اندازہ آسان ہو جائے گا۔ اُردوئے معلّےٰ میں مرزا باقر علیخاں صاحب کامل کے نام غالب کا حسب ذیل خط موجود ہے' مختصر القاب کے بعد لکھتے ہیں:-

" تُمہارا خط آیا۔ تمہارے روزگار کی درستی آگے سُن چکا تھا
اب تمہارے لکھنے سے دیکھ بھی لی۔ دل میرا خوش ہوا۔
اور تم خاطر جمع رکھو۔ جیسا کہ مہاراج نے تم سے کہا ہے'
تمہاری ترقی انشاء اللہ تعالیٰ جلد ہوگی۔ مجھ سے جو تم گلہ
کرتے ہو خط کے نہ بھیجنے کا' بھائی اب میری
اُنگلیاں نکمی ہو گئی ہیں اور بصارت میں بھی ضعف
آ گیا ہے' دو سطریں بھی نہیں لکھ سکتا' اطراف و جوانب
کے خطوط آئے ہوئے دھرے رہتے ہیں۔ جب کوئی
دوست آ جاتا ہے میں اُس سے جواب لکھوا دیتا ہوں'

پرسوں کا تمہارا خط آیا ہوا دھرا تھا۔ اب اس وقت مرزا یوسف علی خاں آگئے میں نے اُن سے یہ خط لکھوا دیا تمہاری دادی اچھی طرح ہے، تمہارا بھائی اچھی طرح ہے تمہارے گھر میں سب طرح خیر و عافیت۔ تمہاری لڑکی اچھی طرح ہے۔ کبھی روز کبھی دوسرے تیسرے میرے پاس آجاتی ہے۔" (اردوئے معلےٰ ص ۱۸۹، مئی ۱۹)

مرزا کے مذکورہ خط کے مقابلہ میں دوسرا خط جو اس کی صفاتِ خط نویسی کا نمونہ ہو پیش کیا جا سکتا ہے مگر غالب کے اس خط میں اپنی بیماری اور نقاہت کا حال مذکور ہے بس اسی لئے میں نے اس خط کو منتخب کیا ہے۔ ادھر حضرت قاسم العلوم علیہ الرحمۃ کے مکتوب میں اپنی علالت و نقاہت کا ذکر ہے نیز لوگوں کے طبعی حالات و شکر رنجیوں، نیز علمی تحقیقات پر روشنی ڈالی گئی۔ مختصراً ہر دو خطوط کے بعض حصّے مضمون کے اعتبار سے ملتے ہیں۔ ان دونوں خطوط میں سادگی، بات چیت کا سا لطف، عبارت میں صفائی اور شُستگی حقیقتِ حال کی ترجمانی اور بے ساختگی ہے۔

اب میں حضرت قاسم العلوم رحمۃ اللہ علیہ کے بعض اور خطوط پیش کرتا ہوں جن سے میرے خیال کی مزید تائید حاصل ہونے میں آسانی ہو سکیگی۔ حضرت حکیم نصر اللہ خاں صاحب کو آداب و القاب کے بعد تحریر فرماتے ہیں:۔

"آپ کا عنایت نامہ پہنچا۔ یہ عنایت میرے سر پر۔ مگر میں حیران ہوں۔ نہ میں ایسا عالم نہ ایسا محقق مجھکو آپنے کیوں اس کام کے لئے تجویز کیا۔ مجھ کو تو کبھی فتویٰ لکھنے کا اتفاق نہیں ہوتا، اور نہ میرے پاس اس کام کا سامان، نہ کتابیں، نہ متقدمین و متاخرین کی بیاضیں جو میں اس کام کو سنبھالوں، اس پر مولنا محمد یعقوب صاحب آجکل اپنے وطن کو گئے ہوئے ہیں۔ پھر ایسے مسائل کے جواب لکھے تو کون لکھے۔ ہاں اپنی سمجھ اور خیال کی بات کہئیے تو میں لکھ دوں۔"

(فیوض قاسمیہ ص ۳۲، ۳۳)

مذکورہ بالا عبارت مولنا رحمۃ اللہ علیہ کے مکتوب کا ابتدائی حصّہ ہے یہ خط پورے کا پورا نقل کرنا طوالت سے خالی نہ تھا محض نمونے کے طور پر اتنا حصّہ نقل کرنا کافی سمجھا گیا۔ خط کی اس نثری تحریر کو غور کی نظر سے دیکھیو اور پھر فیصلہ کیجیئے کہ گذشتہ اُنیسویں اور بیسویں صدی کے مکتوب نگاروں کی زبان اور بیان کے اعتبار سے حضرت قاسم العلوم کی یہ نثری تحریر بھی سادہ و دلکش، مسلسل اور پُر لطف ہے۔ عبارت میں بیساختہ پن اور طرزِ تکلم کا سا رنگ ہے۔ کیا غالب کے مکاتیب کا یہی رنگ نہیں۔ بھوڑی دیر کے لئے غالب کی شوخی اور ضرورت سے زیادہ بے تکلفی کو چھوڑ دیئے صرف یہ دیکھیئے کہ خط کی عبارت میں فصاحت، شستگی، روانی اور رنگِ خطابت کس درجے اُبھرتا نظر آتا ہے۔

مولوی عبداللہ صاحب کو ایک خط میں کہ انہوں نے پانی پر دم اور دل کے بائیں جانب ہونے کے متعلق حکمت دریافت کی ہے حضرت قاسم العلوم اِس طرح لکھتے ہیں:۔

عزیز القدر مولوی عبداللہ السلام علیکم

قلت فرصت کے سبب جواب خط کی نوبت نہیں آئی مگر خیال رہتا تھا۔ آج لکھنے بیٹھا ہوں۔ سُنئیے پانی میں دم کی ممانعت کی وجہ خاصی ہے اور ناک پکڑنے کی توجیہ بھی انداز ظرافت و حکمت پر اچھی ہے البتہ عالمانہ طور پر نہیں۔ باقی قلب کے بائیں جانب رکھنے میں یہ حکمت ہے کہ قلب کے دائیں جانب فرشتہ رہتا ہے اور بائیں جانب شیطان۔ اس صورت میں فرشتے کو زیادہ گنجائش ملیگی، اور وہ اس وجہ سے زیادہ مداخلت کر سکے گا۔ باقی سینہ ایک محلِ قیام ہے۔ اس کا دایاں، بایاں کسی معتد بہ شئے سے مقرر کرنا چاہئیے اور اسی کا اعتبار رکھنا چاہیئے۔ البتہ مکان یا محفل میں، یمین و یسار کے لئے مکین و میرِ محفل پر نظر ہوتی ہے۔ سو یہاں بھی میرِ محفل سینہ کہو، یا مکینِ مکان سینہ، قلب کہو، اس لئے فرشتہ کو دائیں طرف جگہ دی اور شیطان کو بائیں طرف جا ملی۔

اور عورت کے پہلوئے مرد سے پیدا ہونے میں حکمت یہ ہے

کہ باشارۂ آیت وَمِنْ اٰیٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً ؕ رشتہ قرابتِ زوجیت سے محبت و اُلفت مطلوب ہے اور ظاہر ہے کہ یہ بات اسی صورت میں خوب حاصل ہو سکتی تھی ________

________ منشی صاحب کو سلام کے بعد مبارکباد تولد دختر کہدینا خداوند کریم عمر دراز کرے اور سعادتمند کرے۔ فقط (محمد قاسم)

مذکورہ خط کتنا سادہ اور سلیس ہے، یہ ظاہر ہے۔ البتہ بعض الفاظ مثلاً معتدبہ، یمین و یسار، ایسے ہیں کہ جن کو قدرے خط کی زبان کے لئے عوام میں مشکل سمجھا جائے گا مگر اس قسم کے بہت سے الفاظ غالب اور دوسرے انشا پردازوں کے یہاں بھی بکثرت ملیں گے بالخصوص مولانا ابوالکلام آزاد کے یہاں تو ان کی بھرمار ہے۔ بہرحال اس مکتوبِ قاسمی کی لسانی اہمیت اپنی جگہ خوب ہے۔

سادگی کے علاوہ، خطابی طرز اپنے تمام نقش و نگار کے ساتھ نمایاں ہے۔ القاب مختصر اور آداب بالکل نہیں۔ مضمون کے لئے زیادہ انتظار کی ضرورت نہیں۔ مکتوب کو جلد ہی شروع کر دیا گیا ہے مولانا اپنے خطوط میں قدیم طرزِ نگارش کے مطابق یہ نہیں لکھتے کہ میں خیریت سے ہوں اور آپ کی خیر و عافیت خدائے قدیر سے طلبگار ہوں، بلکہ بغیر تمہید کے مضمون شروع فرما دیتے ہیں۔

فیوض قاسمیہ کا تیسرا خط حضرت قاسم العلوم نے کسی صاحب کے بعض علمی مسائل کے سوالات کے جواب میں تحریر فرمایا ہے۔ یہ خط چار صفحات تک چلا گیا ہے اس لئے پورے کے پورے خط کو لکھنا دشوار ہے البتہ اس کے بعض اقتباسات پیش کرتا ہوں۔

مولانا لکھتے ہیں:۔

بھائی صاحب آپ کا عنایت نامہ تو پہنچا۔ مگر بڑا افسوس یہ ہے کہ آپ نے کتب کے حوالے اور صفحے، جلد، اور فصل اور باب کا نشان نہ لکھا۔ یہ مضامین آپ نے کسی اور ہی سے لکھوائے ہوں گے۔ جہاں اتنا لکھوایا تھا وہاں اتنا اور بھی لکھوانا تھا۔

آپ جانتے ہیں میں خود ذی علم نہیں اور یہاں کوئی ایسا ذی علم نہیں، البتہ بعض کتب یہاں میسر آسکتی ہیں، اگر آپ نشان بھی لکھ دیتے تو مقامات مذکورہ کتابوں سے بشرط دستیابی نکالکر کسی عالم کی خدمت میں بھیجتا۔ اور ان سے جواب منگاتا اب فقط آپ کے اطمینان پر موافق بیان بعض احباب کچھ عرض کرتا ہوں۔

سنئے! آیت فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ وَمَا كَانُوْا مُنْظَرِيْنَ کفار یعنی قوم فرعون کے حق میں نازل ہوئی ہے۔ اس صورت میں اہلِ اسلام اس سے مستثنےٰ ہوں گے۔ کیونکہ کفار کی تخصیص اس پر شاہد ہے کہ اہلِ اسلام پر آسمان و زمین دونوں روتے ہیں ورنہ کفار کی کیا خصوصیت رہی۔ ________

اب ایک دو باتیں عقلی بھی سن لیجئے گو وہ بھی تعلقِ نقلیات سے خالی نہیں۔ جناب عالی اعلیٰ درجے کی رفاقت تو کسی کے ساتھ یہ ہے کہ کسی کی بلا اپنے ذمے لے لے یا اس کے لئے سفارش کرے، یا اس کے عوض کچھ دے کر چھڑا لے یا اس کی مدد کر کے اس کو بچا لے۔ چنانچہ آیت واتقوا یوماً لا تجزی نفس عن نفس شیئاً ولا یقبل منہا شفاعۃ ولا یوخذ منہا عدل ولا ہم ینصرون میں اس کی طرف اشارہ ہے۔ اور ادنیٰ درجے کی رفاقت یہ ہے کہ اس کی مصیبت کو دیکھ کر رو پڑے، اور اس کا ادنیٰ درجہ پر ہونا اس سے ظاہر ہے کہ کسی کا رونا کسی کو نافع نہیں۔ پس اس کی طرف اس آیت یعنی فما بکت علیہم السماء والارض میں اشارہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کفار کو اتنی بھی رفاقت

نصیب نہ ہوئی۔ ——

جو عالم ذکر شہادتین کرتے ہیں یا انہوں نے کیا ہی اُن کی غرض یہ ہے کہ سامعین کو یہ معلوم ہو جائے کہ دین میں جان بازی اور جان نثاری و پختگی اور ثبات و استقامت چاہیئے —— حضرت امام حسین علیہ السلام نے جان و مال کا لحاظ کیا نہ زن و فرزند کا خیال کیا نہ بھوک پیاس کا دھیان کیا نہ اپنی بے کسی اور بے سر و سامانی کا۔ جان نازنین پر راہِ خدا میں کھیل گئے اور خویش و اقربا اور احباب کو قتل کرا دیا پر دین کو بٹّا نہ لگنے دیا

—— (فیوض قاسمیہ ص۳۰)

حضرت شہر بانو، بادشاہ یزدجرد شاہ فارس کی بیٹی تھیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں غنیمت میں آئی تھیں۔ ان کو حضرت عمرؓ نے حضرت امام حسینؓ کے حوالے کر دیا تھا اور دو اور جو اُن کی بہنیں تھیں ایک ماہ بانو اور ایک مہر بانو، اُن میں سے ایک تو حضرت محمد بن ابی بکر کو دیدی تھی اور ایک عبد اللہ بن عمر کو ملی تھی مگر جہاد کی عورتوں سے نکاح کی حاجت نہیں ہوتی اس لئے نکاح کی نوبت نہیں آئی۔ اس تقریر سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت حضرت علیؓ اور حضرت امام حسن اور حضرت امام حسین علیہم السلام کے نزدیک حق تھی ورنہ پھر جہاد کے صحیح ہونے اور غنیمت کے حلال ہونے کی کوئی صورت نہیں۔ اگر اُن کی خلافت صحیح نہ ہوتی تو پھر سوچنے کی بات ہے کہ یہ اعتراض کہاں کہاں تک پہنچتا ہی۔ اس صورت میں یہ بھی معلوم ہو گیا ہو گا کہ قاسم بن محمد بن ابو بکر اور سالم بن عبد اللہ بن عمر یعنی ایک ابو بکر کے پوتے اور ایک حضرت عمر کے پوتے حضرت امام زین العابدینؓ کے خلیرے بھائی ہیں۔ پھر اس قرابت تازہ ہی کے سبب اور رشتے ہوتے رہے۔ چنانچہ حضرت قاسم کو امام صادق کے نانا بھی ہیں۔ والسلام سید رحیم بخش صاحب

رونق افروز میرٹھ ہوں تو اُن سے میرا سلام عرض کر دینا، اور اُن کے فرزند سے بھی، یاد رہے تو سلام کہہ دینا۔ فقط۔

(فیوض قاسمیہ ص۱۶، ص۱۷) (محمد قاسم)

مذکورہ خط میں حضرت قاسم العلوم کی تحریر کے مختلف ٹکڑے ہیں۔ تمام مکتوب طوالت کے باعث قلم انداز کر دیا گیا ہے، دکھانا صرف یہ ہے کہ پُرانی وضع کا ایک عالم اور وہ بھی نانوتہ ضلع سہارنپور کے ایک قصبہ کا رہنے والا، جہاں کی زبان ثقیل، ناہموار اور غیر شُستہ ہے، وہاں سے اس قسم کی سادہ، اور فصیح اور صاف زبان کا مالک ایسی اچھی زبان پیش کر رہا ہے جس کو ادبیات میں شامل نہ کرکے تبصرہ نہ کرنا ادب کی معلومات پر گمنامی کا پردہ ڈالنا ہے۔ حضرت قاسم العلوم نے اس خط کو بھائی صاحب سے شروع فرمایا ہے، یہی القاب اور یہی آداب ہے اور پھر مضمون شروع کر دیا گیا ہے، یہ قدامت میں جدت ہے، رنگ خطابت ہر خط میں صاف نظر آتا ہے چنانچہ یہاں بھی ہے۔ اس امر کا اظہار اس ادبی مقام پر کرنا مولانا کے ادبی پس منظر پر ظلم ہوگا کہ حضرت قاسم العلوم نے بارہ ۱۲ سال کی عمر سے پچیس سال تک مسلسل دلّی میں گذارے تھے اس لئے عہد طفلی کے دور میں آپ کی زبان پر دلّی کا یقیناً اثر پڑا تھا۔ بعد ازاں میرٹھ کے قیام نے بھی مولانا کے اُردو ادب اور اُردو زبان پر اثر ڈالا ہے، مولانا کی عُمر کا بیشتر حصہ دہلی اور میرٹھ میں گذرا ہے، دہلی تو زبان اُردو کی ٹکسال تھی ہی مگر میرٹھ کی زبان بھی شُستگی میں کچھ کم نہیں۔ (باقی باقی)

بقیہ "فلسفۂ نعمت و مصیبت"

انسان کو شرعی تکلیف دی گئی ہو گو وہ کسی حد تک اس کے افعال سے کھلے بھی ہوں، ایسے ہی وجود بھی اُس کے ہاتھ میں نہیں نہ اپنا نہ کائنات کا غرض طبعی آثار کے لئے طبعی ما بہ الربط کی ضرورت ہے جو انسانی افعال اور کائنات کے خواص و افعال میں رشتہ ارتباط کا کام دے، اور وہ وجود طبعی ہے جو انسان کے ان عیوب و نیز معتدل افعال کے اثر اشیاء کائنات تک اور پھر اشیاء کائنات کا لوٹا ہوا اثر بطور رد عمل انسانی نفوس تک لانے اور لیجانے میں درمیانی رابطہ بنا ہوا ہے اور بجلی سے بھی زیادہ تیزروی سے یہ کام انجام دیتا ہے۔ اور اس طرح سے ایک حد تک انسان کی عدمی حرکتوں سے کائنات کی سلبی آفات کے تکوّن اور حدوث کی کیفیت پر روشنی پڑ جاتی ہے جو اس فصل کا موضوع تھا۔ وللہ الحمد۔

ایضاح الحق الصریح
صلوٰۃ احتیاط الظہر

ایک تحقیقی بحث ——— اور ——— ایک فقہی مسئلہ :-

(مولانا محمد صاحب انوری لائل پوری)

"رسالہ دار العلوم کے ایک تبصرے میں احقر نے ایک غیر مقلد عالم کے اس اعتراض کا جواب دیا تھا کہ حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب کشمیریؒ نے حضرت شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی تصنیف "تقویۃ الایمان" پر اُن کی دوسری کتاب "ایضاح الحق الصریح" کو فوقیت دی ہے۔ میرے کرم فرما مولوی مودود الحسن صاحب جونپوری نے مشرقی پاکستان سے ایک خط میں تحریر فرمایا کہ "ایضاح" حضرت شہیدؒ کی تصنیف ہی نہیں، اور اس کے ساتھ ہی 'صلوٰۃ احتیاط الظہر' کے خلاف حضرت گنگوہیؒ کے ایک فتوی پر بھی شبہ ظاہر کیا تھا۔ احقر نے برادر مذکور کا یہ خط اپنے محترم مولانا محمد صاحب انوری کی خدمت میں پیش کیا کہ مولانا موصوف، حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے علوم پر بھی مبصرانہ نظر رکھتے ہیں، اور حدیث و فقہ پر بھی ان کی عالمانہ دسترس مسلم ہے۔

یہ دونوں تحریریں درج ذیل ہیں۔ تاکہ پورے حلقۂ دار العلوم کو ان علمی مباحث میں شرکت کا فائدہ ہو سکے"۔

(مدیر)

امر اوّل

الحمد للہ وکفیٰ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ کے متعلق اُیذان الوری ص۴۲ میں حضرت مولانا عبد الاول صاحب جونپوریؒ نے لکھا ہے "شاہ صاحب نفس قدسیہ حنفی المذہب تھے" اور بخاری شریف کا وہ نسخہ جو حضرت شاہ صاحب دہلویؒ کے زیر درس رہتا تھا اُس کی پیشانی پر اپنے قلم مبارک سے اپنے آپ کو حنفی عملاً تحریر فرمایا ہے۔ رسالہ دار العلوم دیوبند کے کسی نمبر میں بھی اس کا تذکرہ موجود ہے۔ مولانا عبد الاول صاحب جونپوریؒ نے "مفید المفتی" یرجع الیٰ نہایت عمدہ تصنیف ہے شاہ صاحبؒ کو حنفی المذہب علماء میں شمار کیا ہے۔ حضرت کی تصانیف میں جو سرسری نظر سے سامنے آیا وہ عرض ہے۔

(۱) "دولت شام (اموی سلطنت) کے خاتمہ تک کوئی اپنے آپ کو حنفی یا شافعی نہ کہتا تھا بلکہ اپنے اپنے ائمہ اور اساتذہ کے طریقہ پر دلائل شرعی سے استنباط کرتے تھے دولت عراق کے زمانہ میں ہر ایک نے اپنا ایک نام معین کیا اور یہ کیفیت ہوگئی کہ جب تک اپنے بڑوں کی نص نہ پاتے کتاب و سنت کی دلیل پر فیصلہ نہ کرتے اس طرح وہ اختلاف جو تاویل کتاب و سنت کے مقتضاء سے ناگزیر طور پر پیدا ہوتے تھے مستقل بنیادوں پر قائم کر دیئے گئے۔

(۲) تو ہر ایک نے جو کچھ اپنے مذہب فقہی سے یاد کیا تھا اسی کو اصل بنا لیا پہلے جو چیز مذہب میں مستنبط تھی اب وہ سنت مستقرہ بن گئی، اب ان کے علم کا مدار اس پر رہ گیا کہ تخریج پر تخریج کریں، اور تفریع پر تفریع" (ازالۃ الخفا)

(۳) مصفّیٰ میں لکھتے ہیں " ہمارے زمانہ کے سادہ لوح اجتہاد سے بالکل برگشتہ ہیں اونٹ کی طرح ناک میں نکیل پڑی ہے اور کچھ نہیں جانتے کہ کدھر جا رہے ہیں ان کا رویہ ہی دوسرا ہے یہ بیچارے ان امور کی سمجھ بوجھ کے لئے مکلف ہی نہیں۔"

(۴) تفہیمات میں فرماتے ہیں " دوسری بیماری یہ ہے کہ فقہ میں حنفی شافعی وغیرہ کے سخت اختلافات پائے جاتے ہیں ہر ایک اپنے طریقے میں تعصب برتتا ہے اور دوسروں کے طریقے پر اعتراض کرتا ہے ہر مذہب میں تخریجات کی کثرت ہے اور حق اس غبار میں چھپ گیا ہے۔"

(۵) " میں ان طالبانِ علم سے کہتا ہوں جو اپنے آپ کو علماء کہتے ہیں کہ بے وقوفو! تم یونانیوں کے علوم اور صرف اور نحو و معانی میں پھنس گئے اور سمجھے کہ علم اس کا نام ہے حالانکہ علم تو کتاب اللہ کی آیت محکمہ ہے یا پھر وہ سنت ہے جو رسول اللہ سے ثابت ہو تم پچھلے فقہاء کے استحسانات اور معلومات میں ڈوب گئے، کیا تمہیں معلوم نہیں کہ حکم صرف وہ ہے جو اللہ اور اس کے رسول نے فرمایا ہو؟ تم میں سے اکثر لوگوں کا حال یہ ہے کہ جب کسی کو نبی کی حدیث پہنچتی ہے تو وہ اس پر عمل نہیں کرتا اور کہتا ہے کہ میرا عمل تو فلاں کے مذہب پر ہے نہ کہ حدیث پر، پھر وہ حیلہ پیش کرتا ہے کہ صاحب! حدیث کا فہم اور اس کے مطابق فیصلہ تو کاملین اور ماہرین کا کام ہے اور یہ حدیث ائمہ سلف سے چھپی تو رہی نہ ہوگی پھر کوئی وجہ تو ہوگی، جان رکھو یہ ہرگز دین کا طریقہ نہیں ہے تم اپنے نبی پر ایمان لائے ہو تو اس کا اتباع کرو خواہ کسی مذہب کے موافق ہو یا مخالف۔"

(۶) سچ پوچھو تو ہر گروہ میں دین کی تحریف پھیلی ہوئی ہے، صوفیاء کو دیکھو تو ان میں ایسے اقوال زبان زد ہیں جو کتاب و سنت سے مطابقت نہیں رکھتے خصوصاً مسئلہ توحید میں، اور معلوم ایسا ہوتا ہے کہ شرع کی انھیں بالکل پروا نہیں ہے۔ فقہاء کی فقہ کو دیکھو تو اس میں اکثر وہ باتیں ملتی ہیں جن کے ماخذ کا پتہ ہی نہیں مثلاً دہ در دہ کا مسئلہ اور کنوؤں کی طہارت کا مسئلہ الخ"

(۷) " وجدان پرستی اور یہ صوفیوں کی مقبولیت اور ان کی حلقہ بگوشی کی وجہ سے ہے جس نے مشرق سے مغرب تک لوگوں کو گھیر رکھا ہے یہاں تک کہ ان حضرات کے اقوال و احوال لوگوں کے دلوں پر کتاب و سنت اور ہر چیز سے زیادہ تسلط رکھتے ہیں ان کے رموز و اشارات اس قدر دخل پا گئے ہیں کہ جو شخص اُن کے رموز و اشارات کا انکار کرے یا اس سے خالی ہو وہ نہ مقبول ہوتا ہے نہ صالحین میں شمار ہوتا ہے، ممبروں پر کوئی واعظ ایسا نہیں جس کی تقریر اشارات صوفیہ سے پاک ہو اور درس کی مسندوں پر کوئی عالم ایسا نہیں جو ان کے کلام میں اعتقاد اور خوض کا اظہار نہ کرے الخ" (تفہیمات الٰہیہ)

اِن عبارات کو بار بار پڑھئے استحسانات فقہاء جزئیات فقہ، بالخصوص فقہ حنفی تصوّف اور صوفیاء کرام، اولیاء اللہ کے اقوال، اشارات، احوال، تقلید، غرض ان کے زائد اور تجاوز عن الحدود امور خوب تنقید فرمائی گئی ہے۔ حجۃ اللہ البالغہ۔ ازالۃ الخفاء۔ تفہیمات الٰہیہ بدور بازغہ وغیرہا کتب میں اس قسم کا ذخیرہ خوب موجود ہے، ہاں! مسوّیٰ، مصفّیٰ اور القول الجمیل۔ انتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ۔ انفاس العارفین، ہوامع، الطاف القدس وغیرہا کتب میں شاہ صاحب مرحوم نے اِن اُمور کی تائیدات، تشریحات و توضیحات تفصیل سے فرمائی ہیں پھر ان تمام امور کے باوجود کوئی حنفی مقلد بزرگ ان کی کتب سے نہ انکار کرتا ہے نہ یہ کہتا ہے کہ یہ شاہ صاحبؒ کی تصنیفات نہیں۔ اِسی طرح حضرت شہیدؒ نے تقویۃ الایمان، ایضاح الحق الصریح بھی لکھیں اور عبقات اور صراط مستقیم وغیرہ بھی لکھیں۔ چونکہ حسب روایات اساتذہ ان کو اپنے دادا صاحب مرحوم کے مسلک کی طرف رجحان تھا اور یہی رنگ غالب تھا لہذا ان اُمور کے باعث نہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ کسی غیر مقلد کی کتاب ہے نہ یہ کہ (ایضاح الحق الصریح) شاہ شہید کی تصنیف نہیں۔

(۱) اِس کتاب میں فرماتے ہیں:—

" احکام مستنبطۂ مجتہدین سابقین خواہ بایں وجہ باشد کہ فلاں امر واجب است یا مندوب یا مباح یا مکروہ

یا حرام یا بایں وجہ باشد کہ فلاں امر رکن فلاں امر است یا شرط او یا ہیئت مکملۂ او یا سبب او یا لازم او یا اثر او یا ثمرۂ او یا منافی او یا عوض او وامثال آں و مراد از امر اعم است ازانکہ از جنس عقائد عقلیہ باشد یا امور قلبیہ یا افعال جوارح از عبادات یا عادات و یا از معاملات ہمہ از قبیل سنت حکمیہ است ہرگز در قسمے از اقسام بدعت داخل نیست چہ حکم مذکور از قبیل محدثات اصلا نیست الخ" (ص۲)

(۲) نیز فرماتے ہیں:-

"قیاس در احکام مشروع است بحکم کریمہ "فاعتبروا یا اولی الابصار" (ایضاح ص۷)

(۳) بالجملہ مسائل مستنبط مجتہدین سابقین کہ مسلم الاجتہاد اند بقیاسات صحیحہ بیشک از قبیل سنت حکمیہ اند (ص۵)

یہی مضمون ص۹ پر فرمایا ہے۔

(۴) ص۹۴ پر فرماتے ہیں:-

"مسائل اجماعیہ امت محمدیہ علی صاحبہا افضل الصلوٰۃ والتسلیمات در ہر قرن کہ بوجود آید ہمہ از قبیل سنت است چہ ہستند آں مسائل در نفس الامر سنت حقیقیہ است یا ملحق بالسنۃ یا سنت حکمیہ و آں ہم از قبیل مطلق سنت است"

(۵) حاصل کلام آنکہ مسائل اجماعیہ ہر قرن از قبیل سنت است۔ (ص۹۷)

(۶) ص۲۶ پر فرماتے ہیں:-

"چنانکہ تحقیق بحث اول موقوف بر تفصیل امور دین بود ہمچنیں تحقیق ایں بحث موقوف بر ابواب تشریع است پس می گوئیم تعیین صور خاصہ و تحدید حدود معینہ برائے اصول دین از جہت شارع بدو طریق متحقق می گردد اول بطریق لزوم یعنی بایں وجہ تعیین فرماید کہ اصل مذکور بدون ایں صورت خاصہ اصلا در نظر شارع معتبر نیست یا کالعدم است، ثانی بطریق تکمیل یعنی بایں وجہ تعیین فرماید کہ ہرگاہ اصل مذکور بایں صورت خاصہ متحقق گردد در نظر شارع بہایت مستحسن و ممدوح باشد"

(۷) اس کے بعد وجوہ متعددہ (تعیین صور خاصہ اور اصول دین کے لئے حدود معینہ کی تحدید شارع کی طرف سے بطریق لزوم و تکمیل) بیان فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"واز آں جملہ است تعیین امکنہ یا بطریق لزوم مثل تعیین مکان طاہر غیر مقابر و حمامات برائے نماز۔ و امصار برائے نماز جمعہ و اعیاد و مساجد برائے اعتکاف الخ" یعنی شارع کی طرف سے بطریق لزوم مکان پاک نماز کی صحت کے لئے معین فرمایا گیا ہے وہ پاک جگہ قبرستان نہ ہو، حمام نہ ہو، ورنہ نماز جائز نہ ہوگی اور ادائے نماز جمعہ و اعیاد کی صحت کے لئے شہروں کی تعیین فرمائی گئی ہے۔

(۸) مسئلہ رابعہ اشتغال بہ علوم آلیہ مثل علوم عربیہ بقدر ضرورت کہ در فہم معنی ظاہر کتاب و سنت بکار آید و بہ اشغال صوفیہ بقدر حاجت مثل تحریک لطائف ستہ بذکر خفی و مثل یادداشت مسمیٰ بہ پاس انفاس و دوام ملاحظہ بسوئے قلب کہ در تحصیل حقیقت و احسان کہ مفاد ظاہر کتاب و سنت است منفعت بخشد۔ (ص۹۸)

(۹) ص۱۱۵ کے آخر میں فرماتے ہیں:-

بایدد انست کہ حضرت مالک علی الاطلاق و مالک بالاستحقاق جلت قدرتہ بنابر نظم و نسق ملت حق دو کارخانہ عظیم قائم فرمودہ اول آنکہ مدار شیوع ملت بر آن است و آں کارخانہ است کہ بشان ملکیہ تعلق دارد یعنی تکلیف بندگان خود بسوئے اطاعت خود بطریق جبر و الزام کہ چار و ناچار آں را قبول باید کرد و طوعاً و کرہاً ربقۂ اطاعت در گردن خود باید انداخت و مرکز ایں کارخانہ منصب رسالت است و فروع آں مناصب اولی الامر است از خلفائے راشدین

ائمہ عادلین و امرائے جنود مجاہدین الخ (الیضاح)

(۱۰) وثانی کارخانہ ایست بمثابہ متممات اول و مکملات او ست و آں کارخانہ ایست کہ بہ شان ربوبیت تعلق دارد یعنی مہیا کردن امور یکہ بندگاں را در باب امتثال احکام الٰہیہ و اتباع سنت نبویہ بآں احتیاج پیش می آید و مرکز ایں کارخانہ منصب حکومت امت و فروع آں مناصب علماء و اولیاء است از قراء و محدثین کہ احکام الٰہیہ و احادیث نبویہ بجمیع امت می رسانند و مجتہدین شریعت کہ احکام قیاسیہ استنباط می نمایند و شیوخ طریقت کہ بنا بر نظر بر مصالح وقت تدبیرے براجرائے سنت استخراج می فرمایند و ائمہ لغت و تفسیر و عربیت کہ نکات محاورات و قوانین زبان دانی الیضاح می نمایند و واضعین کتب فقہ و جامعین فتاویٰ و مصنفین رسائل سلوک و مؤلفین کتب عربیہ کہ احکام مجتہدین و تخریجات مقلدین و کلمات مشائخ و اقوال علماء عربیہ را مرتب کردہ در دفاتر مبسوط محرر می نمایند، پس اول را کمال خلافت و امامت می گویند و ثانی را کمال علم و ولایت۔ (ص ۸۶ الیضاح)

(۱۱) پھر ان دونوں کو ذکر کر کے فرماتے ہیں:-

وہر چند منشاء ایں ہر دو کمال توجہ عنایت الٰہیہ است بہ تربیت بندگان خود و مہبط آں ہر دو قلوب انبیاء است علیہم الصلوٰۃ والتسلیم اما اول نورے است قوی الاشراق الخ و ثانی آب زلال است کہ از ابر ربوبیت باریدہ و از فوارہ حکمت انبیاء جوش زدہ و ازاں بحیاض قلوب خواص مجتمع شدہ" الخ (ص ۸۷)

پھر ہر دو کے مراتب کا فرق بیان فرما کر راہ اعتدال پیش فرمایا ہے اب اگر شرط انصاف غور فرمایا جائے تو اس کے تسلیم کر لینے سے چارہ کار نہیں کہ مندرجہ بالا مضامین کسی غیر مقلد کے قطعاً نہیں ہو سکتے اجماع و قیاس کو حجت شرعی ماننے پر زور دینا مجتہدین کے اجتہادات و مسائل قیاسیہ کو سنت حکمیہ فرمانا جمعہ و اعیاد کے لئے شہر کے شرط ہونے کو شارع کا لازمی حکم فرمانا کہ اس کے بغیر نماز جمعہ صحیح نہ ہو۔ کس غیر مقلد کا مذہب ہے؟ یادداشت، ذکر اسکی حفاظت، پاس انفاس، لطائف ستہ کے اجراء کا دوام، دوام مراقبہ بسوئے قلب، تحصیل حقیقت و احسان کی ترغیب اعتدال کے ساتھ وغیرہ ذالک۔

یہ امور صاف صاف شہادت دیتے ہیں کہ یہ کتاب حنفی المذہب صوفی مقلد ذاکر شاغل اہل دل کی مصنفہ ہے، واضعین کتب فقہ جامعین فتاویٰ و مصنفین رسائل سلوک مجتہدین کے احکام اور تخریجات مقلدین و کلمات مشائخ کو مرتب کر کے دفاتر میں لکھنے والے جس کے نزدیک کمال علم و ولایت سے موصوف ہوں اسکی تصنیف قابل تردید ہو؟ معلوم نہیں کون منصف اس کو گوارا کریگا؟

فرماتے ہیں:-

"الغرض تحقیق حکم اجمالی درباب ترغیب و ترہیب مومنان پاک و طالبان چست و چالاک و موحدان مبرا از شرک کفایت می کند اما تفتیش تفصیلے پس اصل منصب مجتہدین است و مقلدین را درپئے او افتادن غیر از برپا کردن شور و شغب و قیل و قال و مناظرہ و جدال منفعت نمی بخشد" ص ۱۴۴

غیر مقلدین حضرات تو خلفاء راشدین و دیگر صحابہ پر بھی برسنے سے نہیں رکتے چہ جائیکہ تابعین یا تبع تابعین کے اقوال کی تقلید کریں اور صاحب الیضاح جابجا اتباع صحابہ و تابعین کی تاکید کرتے جاتے ہیں اور تراویح کو بصورت کذائی سنت اور ملحق بالسنہ فرماتے ہیں غیر مقلدین تراویح بیس با جماعت بہیئت کذائی جیسا کہ ائمہ اربعہ کے ہاں پڑھی جاتی ہیں بدعت سمجھتے ہیں بہرحال فرق مراتب کی تو تمام فقہاء امت رعایت کرتے ہیں۔

دیکھو طریقہ محمدیہ جو احناف کی عمدہ عالی شان کتاب ہے بدعات کے کس طریق سے اٹھایا ہے فتاوےٰ قاضی خاں، خلاصۃ الفتاوےٰ، عالمگیری، بحر الرائق، اور مرقات ملا علی قاری کو دیکھئے افراط و تفریط سے کون نہیں روکتا، صاحب الیضاح فرماتے ہیں ص ۱۰۰

"اما اشتغال صوفیہ پس الیق است باخفا و کتمان کہ دست بہ کار و دل بایار و خلوت در انجمن در باب امثال ایں امور قولے است ماثور" یہی ارشاد دیگر صوفیا کرام فرماتے ہیں۔ ہاں اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی فرماتے ہیں۔

کہ ہر عقیدہ و مقامے و وارد ے و حالے و قولے و فعلے کہ از جنس عبادات باشد یا عادات یا معاملات و ہمچنیں تقیید و تعیین امور مذکورہ و حدود معیّنہ و ہمچنیں تشخیص موقعہ آں امور را از تشہیر و اعلان یا ستر یا کتمان و اہتمام یا عدم اہتمام یا التزام و عدم التزام کہ نہ ثابت بہ کتاب باشد نہ بہ سنت نہ باشتہار و رواج در قرون ثلٰثہ و نہ باجماع اہل حق و نہ بقیاس صحیح منقول از مجتہدین سابقین مسلّم الاجتہاد و صاحبش آں را از امر دین شمار دیا با و معاملۂ امور دینیہ کند پس ہماں را بدعت می گوئیم و در اکثر مواضع کتاب و سنت لفظ بدعت بہ ہمیں معنی مستعمل میشود۔"

اور علماء محققین امت بھی یہی فرماتے ہیں۔

صاحب ایضاح فرماتے ہیں:۔

"ہمچنیں محمدیہ خالصہ را شعار خود باید کرد و اقامت ظاہر سنت را کار و بار خود باید داشت و احکام فقہیہ صحیحہ را و اشغال صوفیہ معتبرہ را کہ خالی از شوب فساد و بدعت باشد بقدر حاجت استعمال باید کرد و زائد از حاجت بآں توغل نباید کرد" الخ

پھر یہ بھی دیکھنا چاہیئے کہ جس ماحول میں یہ کتاب لکھی گئی ہے اس وقت عوام بلکہ خواص تک کی کیا حالت تھی اسی واسطے مصنف جابجا تنبیہ فرماتے جاتے ہیں کہ ہمارا روئے سخن عوام الناس کی طرف ہے خواص یا اخص الخواص کو مستثنیٰ فرماتے جاتے ہیں، بلکہ اخص الخواص اگر وہی کام کریں تو اس کو ملحق بالسنۃ قرار دیتے ہیں کتاب کی ہر فصل میں یہ امر نمایاں نظر آ رہا ہے۔ پھر مسئلہ سادسہ کو ص۶۶ سے ضرور دیکھنا چاہیئے۔ باید دانست سے چل کر ایک ضروری امر کی طرف توجہ دلاتے ہیں:۔

"پس بنابر ارتکاب اقسام باقیہ از بدعت خفیفہ و جمیع اقسام بدعت حکمیہ مرتکب آں را مبتدع و صاحب بدعت نتواں گفت پس چنانکہ از معدود کردن بعضے افعال و اقوال و اخلاق از شعب کفر و نفاق مقصود ہمیں است کہ سامعین ازاں اجتناب نمایند نہ آنکہ آنچہ در قرآن مجید از احکام کفار و منافقین از قسم قتل و نہب و سبی و ترقیق و وضع جزیہ کہ در حق کفار وارد شدہ و حرمت صلوٰۃ جنازہ و ممنوعیت زیارت قبور ایشاں و نہی از استغفار برائے اموات ایشاں کہ در حق منافقین وارد شدہ بر صاحب افعال و اقوال و اخلاق مذکورہ مطلقاً اجرا باید کرد ہمچنیں از تعداد اقسام بدعت دریں مقام مقصود ہمیں است کہ سامعین از جمیع اقسام مذکورہ اجتناب ورزند و راہ سنت خالصہ اختیار کنند نہ آنکہ آنچہ در حدیث شریف از احکام مبتدعین و اہل بدعات از قسم حبط اعمال ایشاں و حرمت توقیر ایشاں و اجتناب از عیادت ایشاں و احتراز از مجالست و مخالطت ایشاں و ممنوعیت ابتداء و مصافحہ در کلام و سلام بایشاں بر مرتکب قسمے از اقسام مذکورہ مطلقاً اجرا نمایند حاشا کہ کسے از منصفان حق طلب ایں راہ افراط و غلو بپیماید نعوذ باللہ من ذالک۔"

دیکھیئے ارتکاب بدعت حکمیہ سے مرتکب کو مبتدع کا لفظ نہیں دیتے بلکہ ایسے الفاظ بولنے کو غلو و افراط فرما رہے ہیں۔ سبحان اللہ! کس قدر اتقاء اور احتیاط ہے۔ اور سنیئے فرماتے ہیں:۔

"ارادہ تقلید شخصے معیّن از مجتہدین و مشائخ در ارکان دین نہ بلکہ ہمیں قدر کافی است کہ وقتی حاجت پیش آید از کسے از ایشاں استفسار کردہ شود نہ آں کہ ارادت و تقلید اہم مثل ایمان بالانبیاء از ارکان دین شمردہ شود و لقب حنفی و قادری بمشابہ لفظ مسلمان

وسنی اظہار کردہ شود وامتیاز از شافعیاں وحنفیاں مثل امتیاز از کفار و روافض از لوازم تدین شمردہ شود وانتقال را از مذہبے بمذہبے یا از طریقہ بطریقہ مثل ارتداد وابتداع وبغی موجب قتل وہتک معدود کردہ شود الخ۔

آیا نمی بینی کہ بر اطاعت قاضی جبر کردن می رسد نہ بر اطاعت مجتہد کہ رد حکم قاضی واحد قاضی دیگر را ہم نمی رسد چہ جائیکہ احاد رعایا را بخلاف حکم مجتہد کہ بر ہر کسے قبول آں واجب نیست لاسیما وقتیکہ آں کس خود مجتہد باشد کہ او را تقلید مجتہد اول اصلا جائز نیست۔"

غور فرمائیں کہ خاص شیخ کی ارادت اور خاص امام مجتہد کی تقلید تو کسی بھی فقیہہ دین نے فرض اور رکن نہیں قرار دی، اس رکن اور فرض قرار دینے اور اس کے برخلاف صورت پر باہمی جنگ و جدال اور فرقہ بندی ہی کو نامناسب فرمایا ہے نفس تقلید شخصی کو ناجائز نہیں فرمایا، اس عبارت کو خوب غور سے مطالعہ فرما کر عوام الناس بلکہ خواص کی حالت کا اندازہ لگائیں کہ ان امور پر باہمی کس قدر اکھاڑہ بندی ہو رہی ہے فالی اللہ المشتکیٰ۔

خود ملا محب اللہ بہاری کی مسلم الثبوت کو دیکھ لیا جائے کہ تمذہب بمذہب معین کو لابدی قرار نہیں دیتے۔ صاحب ایضاح نے تو فقط ایک مجتہد کو دوسرے مجتہد کی تقلید کے ناجائز ہونے کو لکھا ہے۔

شرح عین العلم میں ملا علی قاریؒ کی عبارت بھی دیکھ لی جائے حضرت شہیدؒ کی ایضاح کی عبارت مذکورہ بالا اور عبارت صراط مستقیم میں باہمی کوئی تخالف نہیں تضاد نہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں:۔

"در اعمال اتباع مذاہب اربعہ کہ رائج در تمام اہل اسلام است بہتر و خوب است لیکن علم پیغمبر منحصر در علم یک شخص ندانند" (صراط مستقیم)

ایضاح میں جا بجا اتباع اجتہاد ائمہ مجتہدین کو سنت حکمیہ فرمایا ہے اور اوپر کی طویل عبارت میں مخصوص امام کی تقلید ہمیشہ کے لئے فرض اور رکن ہونے کی نفی فرمائی ہے۔ کسی چیز کے فرض ہونے کی نفی سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ مستحب بھی نہ رہے۔

صراط مستقیم کی ایک اور عبارت ملاحظہ فرمائیے:۔

"پس در ہر مسئلہ کہ حدیث صحیح غیر منسوخ یابد اتباع مجتہد دراں نکند"

بتلائیے! احباب صراط مستقیم کو تو یقیناً حضرت شہیدؒ ہی کی کتاب یقین کرتے ہیں۔ رد المحتار میں بھی یہی لکھا ہے "جب مذہب کے خلاف حدیث صحیح ہاتھ لگے تو اس حدیث پر عمل کیا جائے اور یہ اس کا مذہب بن جائے گا اور کوئی شخص حدیث پر عمل کر لینے سے اپنے حنفی پن سے باہر نہ آئے گا" یہ علامہ شامی ابن عابدین کی تصریح ہے جو حنفیہ کی مقبول اور متداول کتاب ہے۔ ملا علی قاری شرح عین العلم میں فرماتے ہیں:۔

"یہ تو معلوم ہی ہے کہ [illegible] تعالیٰ نے کسی کو یہ تکلیف نہیں دی کہ حنفی بنے یا مالکی بنے شافعی بنے یا حنبلی بلکہ انھیں یہ تکلیف دی ہے کہ وہ سنت کے بموجب عمل کریں، اگر عالم ہوں یا علماء کی پیروی کریں اگر ناواقف ہوں"

علامہ عبد العلی بحر العلوم حنفیؒ نے شرح تحریر میں لکھا ہے کہ:۔

"تحقیق ایک مجتہد کی عمل کے باب میں دھینگا دھینگی ہے اس کی طرف التفات نہ کرنا چاہیئے یہ تو شریعت کو بدل ڈالنا ہے"

(باقی آئندہ)

تیسری قسط:-

حضرت مولٰنا احمد حسن صاحب محدّث (امروہی رح)

(از مولٰنا نسیم احمد فریدی اُستاذ مدرسہ عربیہ امروہہ)

دار العُلوم دیوبند میں تقرّر

چونکہ دار العلوم کی پُرانی رُودادیں میرے سامنے نہیں اِس لئے سَن تو نہیں لکھ سکتا لیکن قیام مدرسہ امروہہ کے چند سال بعد دار العُلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ نے حضرت محدث امروہی رح کو دار العلوم دیوبند میں بُلا لیا۔ حضرت شیخ الہند رح کو اور آپ کو برابر درجے پر رکھا گیا۔ البتہ حضرت مولانا امروہی رح کی تنخواہ قدرے زیادہ رکھی گئی۔

حضرت مولٰنا امروہی رح و[illegible] یا دو ماہ سے زائد نہیں رہے۔ اُس زمانہ میں مولٰنا قمر الدین صاحب سیہنسپوری جنہوں نے سند فراغ امروہہ سے حاصل کی ہے دار العلوم میں تعلیم پارہے تھے، اُن کی زبانی دار العُلوم دیوبند میں حضرت مولٰنا امروہی رح کے پہلے درس کا حال سُنیئے بیضاوی، شمس بازغہ، صدرا وغیرہ کتب حضرت مولٰنا امروہی رح کے سپُرد کی گئیں۔ سب سے پہلے صدرا پڑھنے والوں کو آواز دی گئی اس کتاب میں تین پنجابی طالب علم شامل تھے جن میں ایک مولوی نور آزماں پنجابی دوسرے مولوی عبد الحلیم تیسرے ایک اور ذی استعداد پنجابی طالب علم تھے جن کا نام یاد نہیں۔

یہ تینوں طالب علم تمام کتابیں ختم کر کے علم حدیث پڑھنے دیوبند آئے تھے۔ جب حضرت مولٰنا امروہی رح کی آمد آمد ہوئی تو ان طالب علموں نے آپس میں مشورہ کیا کہ مولٰنا امروہی رح کی معقولات میں بڑی شہرت سُنی ہے ان کو آزمانا چاہیئے۔ (غالباً اسی غرض سے صدرا میں شامل ہوئے) آواز دینے پر یہ تینوں طالب علم حاضر ہو گئے۔ مولٰنا امروہی رح نے فرمایا اچھا شروع کیجئے۔ ایک نے پڑھنا شروع کیا کچھ اعراب میں غلطی ہو گئی۔ مولٰنا رح نے خاص انداز میں فرمایا۔ مولوی صاحب سنبھل کر پڑھیئے! یہ سُننا تھا کہ طالب علم کی روح فنا ہو گئی۔ پھر خود بتلایا یُوں پڑھیئے۔ اس کے بعد مولٰنا رح نے فرمایا۔

مولوی صاحب میں ایک تقریر کرتا ہوں، غور سے سُن لینا۔

چنانچہ مولٰنا رح نے ایک تقریر فرمائی جب تقریر ختم ہو گئی تو فرمایا اب ترجمہ کیجئے۔ درمیانِ ترجمہ میں ایک نے گردن اُٹھائی اور کچھ پوچھنا چاہا۔ فرمایا کچھ پوچھنا ہے؟ طالب علم نے اپنا شُبہ پیش کیا۔ فرمایا۔ میں اس کا جواب اپنی تقریر میں دے چکا ہوں، آپ نے غور نہیں کیا۔ پھر دوبارہ تقریر فرمائی، تقریر میں اُس کے شُبہ کا جواب موجود تھا۔ بالآخر معترض صاحب نے شرم کے مارے اپنی گردن جھکا دی۔

سبق کے بعد تینوں یہ کہتے ہوئے سُنے گئے کہ "معقولات تو دیوبند والوں کے پاس ہے"۔ مولٰنا قمر الدین صاحب بیان کرتے ہیں کہ حضرت مولٰنا کو دیوبند میں ایک دو ماہ کا عرصہ ہوا تھا کہ مولوی نادر شاہ خاں صاحب وکیل، مہتمم مدرسہ امروہہ، دیوبند پہونچے، اُن سے بعض اشخاص نے دریافت کیا کہ کیسے تشریف لائے تو انہوں نے فرمایا کہ "ایک باغ ہم نے لگایا تھا جب وہ بار آور ہوا تو اُس کا باغبان چلا گیا، اب وہ باغ خراب ہو چلا"۔

مولٰنا قمر الدین صاحب فرماتے ہیں کہ ہم سمجھ گئے کہ یہ حضرت مولٰنا کو لینے آئے ہیں۔ مولوی نادر شاہ خاں صاحب وکیل، حکیم مشتاق احمد صاحب مرحوم سے بھی ملنے گئے اور اُن کو بتلایا کہ امروہہ میرا مکان ہے اِس مقصد سے حاضر ہوا ہوں۔ اُن سے بھی یہی بات کہی کہ ہمارا باغ اُجڑنے کا اندیشہ ہے۔ حکیم صاحب نے فرمایا "خاں صاحب آپ پریشان نہ ہوجیے آپکے باغ کا خیال رکھا جائے گا"۔ حکیم صاحب اطمینان دلاکر ممبروں کے پاس گئے۔ سب ممبروں نے اطمینان دلایا، کہ مولٰنا کو امروہہ بھیجدیا جائے گا۔ چنانچہ سب نے مشورہ کر کے طے کیا'

کہ چونکہ مدرسہ امروہہ کا قائم رکھنا بھی ضروری ہے اس لئے حضرت مولٰنا کو امروہہ واپس بھیجدیا جائے۔

مولٰنا دوبارہ اپنے مدرسہ میں تشریف لے آئے، مولوی نور الزمان صاحب بھی کچھ دنوں بعد امروہہ آگئے، یہاں پر اُن کو کچھ عرصے بعد مدرس بنا دیا گیا۔

نودرہ میں درس دیا

دار العلوم میں نودرہ کی کسی درسگاہ میں حضرت مولٰنا امروہی درس دیتے تھے۔ مولٰنا قمر الدین صاحب بیان کرتے ہیں "ایک دن ایسا ہوا کہ کچھ طلباء عین اُس وقت جبکہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ درس دے رہے تھے آپ کی درسگاہ کے قریب برآمدے میں بیٹھ کر زور زور سے مذاکرہ کرنے لگے۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے درسگاہ سے باہر نکل کر پُر ہیبت لہجے میں اُن کو ڈانٹ بتلائی، وہ طلباء خائف ہو کر بھاگ گئے اور حضرت شیخ الہند کی درسگاہ میں جا کر پناہ لی۔ حضرت شیخ الہند نے فرمایا "میر صاحب کو غصہ آرہا ہے" اس کے بعد کسی طالب علم کی مجال نہ تھی، کہ آپ کی درسگاہ کے قریب کچھ بول سکے۔

مولٰنا کی علمی شہرت

حضرت قاسم العلوم کے ممتاز شاگرد ہونے کی وجہ سے اُن کی علمی شہرت نہ صرف ہندوستان کے گوشے گوشے میں بلکہ بیرونِ ہند میں بھی ہوگئی تھی، ہندوستان کے ہر ہر صوبے کے نیز افغانستان وغیرہ کے طلباء شدِ رحال کر کے امروہہ آتے تھے۔ یہاں پر شمع حدیث رسول کے پروانوں کا زبردست ہجوم رہتا تھا۔ بعض دوسرے مدارسِ ہند کے طلباء بھی بغرض تعلیم امروہہ آگئے تھے۔

"انشائے مظہر" کے مصنف مولٰنا مظہر الحق مظہر چاٹگامی تقریباً ۱۳۰۵ھ میں کان پور کے مدرسہ سے امروہہ میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے آئے۔ چنانچہ مکتوب یاندہم میں لکھتے ہیں:۔

"قریب بست روز بانقضائے رسید کہ بندہ از شہر کان پور نقل نمودہ بقصبہ امروہہ آمد بعالی جناب فخر علمائے زمن مولٰنا سید احمد حسن صاحب دام نوالہم کتاب جلالین شریف ترمذی شریف، ہدایہ اخیرین، مقامات حریری درس دارد۔"

(انشائے مظہر ص ۹ مطبوعہ ...)

طریقہ درس

حضرت محدث امروہی کی تقریر نہایت جامع، شستہ اور پُر مغز ہوتی تھی جس سے طلباء کی پوری پوری تشفی ہو جاتی تھی اور اُن کا دامنِ طلب گلہائے مقصود سے بھر جاتا تھا۔ تقریر میں وہ اپنے اُستاد کا مکمل نمونہ تھے (آپ کی درسی وعمومی تقریروں کے چند نمونے آگے چل کر پیش کئے جائیں گے)

بعض حدیث کی کتابوں کی قرأت وہ خود کرتے تھے۔ طالب علم جب تک اچھی طرح مطالعہ دیکھ کر نہ آتا مجال نہ تھی کہ مولٰنا کے سامنے پڑھ سکتا۔ اُن کے سامنے عبارت پڑھنے کے لئے بڑی قابلیت، بڑی ہمت اور بڑی حاضر دماغی کی ضرورت تھی۔ ایسی غلطی جو اونچی کتابیں پڑھنے والوں کے لئے زیبا نہیں اُس کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ غصہ وجلال فوراً چہرۂ تاباں پر نمایاں ہو کر پورے حلقے پر اثر انداز ہو جاتا تھا۔ تمام طلباء تھر تھر کانپنے لگتے تھے۔

جہاں تک دورۂ حدیث کا تعلق ہے مجھے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے متعدد تلامذہ سے معلوم ہوا کہ کتب صحاح کو کم از کم دو سال میں ختم کراتے تھے۔ اگر ایک سال ترمذی شریف پڑھائی تو دوسرے سال بخاری شریف اور دیگر کتب۔ انہوں نے دورے کی کتب کو حسب صوابدید اپنی خاص ترتیب کے ساتھ نصاب میں رکھا تھا ترمذی کے درس میں بہت تفصیل سے تقریر فرماتے تھے۔ ہر ہر مسئلہ کو عقلی ونقلی حیثیت سے سمجھاتے تھے۔ اپنے اُستاد کی وساطت سے اُن کو جو خاص علم کلام حاصل ہوا تھا اُس کو اپنے درس میں آشکارا کرتے تھے۔ اُن کے حلقۂ درس میں ایک طرف حضرت قاسم العلوم کے طریقۂ استدلال کی یاد تازہ ہوتی تھی تو دوسری طرف حکمت ولی اللہی اور ذکاوت عزیزی اپنی پوری تابانی کے ساتھ جلوہ گر نظر آتی تھی۔ افسوس کہ آپ کی درسی تقاریر کے مکمل مجموعے جو چند سال پیشتر تک آسانی سے مل سکتے تھے باوجود تلاش کے دستیاب نہ ہو سکے۔ ورنہ اُس سے بہت کچھ علمی سرمایہ ہاتھ لگتا۔ تقریر ترمذی کا ایک نامکمل مجموعہ مجھے حاصل ہوا ہے جس کے چند اقتباس مستقل عنوان کے ماتحت تبرکاً پیش کروں گا۔

صاحب تذکرۃ الکرام آپ کے طریقۂ تعلیم اور افادۂ تدریس کا ذکر

کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"آپ اُن جملہ علوم کی جو درسِ نظامیہ کے نظامِ تعلیم میں شامل ہیں تعلیم دیتے لیکن زیادہ تر شغل حدیث و تفسیر و فقہ کی تدریس سے تھا، آپ کے تلامذہ سے سُنا گیا کہ بیان ایسا واضح اور پُر شوکت ہوتا کہ دقیق سے دقیق مسائل طلباء کی سمجھ میں بہت سہولت سے آجاتے اور اُس کے ساتھ مضمون کی عظمت بھی ذہن نشین ہو جاتی"

طلباء کی اخلاقی نگرانی

حضرت رحمۃ اللہ علیہ طلباءِ علوم دینیہ کی جہاں ہر قسم کی سہولتوں کا لحاظ رکھتے تھے وہاں اُن کو یہ فکر بھی تھی کہ ان کی اخلاقی نگرانی بھی پوری طرح ہو، مدرسہ کی حدود میں اور مدرسہ کے باہر یکساں طور پر کڑی نگاہ اُن پر رہتی تھی بقول مؤلف تذکرۃ الکرام "شاگردوں کے ساتھ آپ کا برتاؤ حکیمانہ ہوتا تھا، سختی کے موقع پر سختی اور نرمی کے موقع پر نرمی" کوئی خلاف تہذیب عمل طالب علم سے سرزد ہوتا تو اُس کو فوراً ٹوک دیتے تھے۔ طلباء کی وضع قطع کا خاص لحاظ رکھتے تھے۔ آپ کا جلال مشہور تھا۔ بعض اوقات زبانی سرزنش کے علاوہ اچھے اچھے جوان اور قوی ہیکل طلباء کو تربیت کے سلسلے میں زدوکوب بھی کر دیتے تھے۔ درمیان درس میں اور ختم بخاری کے دن خاص طور پر نصیحتیں فرماتے تھے۔

حکیم محمد رفیع صاحب نے بیان کیا کہ ہماری بخاری جب ختم ہوئی تو حضرت مولٰنا نے بے ثباتیٔ دنیا کا نقشہ کچھ اس انداز سے کھینچا کہ میں نے اور میرے ساتھ جو شریک تھے، اُن میں سے کئی طلباء نے اُس تقریر سے متاثر ہو کر یہ تہیہ اور فیصلہ کر لیا کہ اب ہم دنیا سے بالکل بے تعلق اور شہر کی زندگی سے کنارہ کش ہو کر یادِ خدا میں مشغول ہو جائیں گے۔

چنانچہ اس کے لئے عملی پروگرام بھی بنا لیا تھا۔ اتفاق سے حکیم محمد رفیع صاحب کے والد کو اپنے بیٹے کا ارادہ معلوم ہو گیا۔ حضرت مولٰنا کے سامنے اس کا ذکر کر دیا۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے سمجھایا کہ اُس تقریر کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ رہبانیت اختیار کر لی جائے اور شیخ سعدیؒ کے یہ مشہور اشعار پڑھے ؎

صاحبدلے بمدرسہ آمد ز خانقاہ
بشکست عہد صحبت اہلِ طریق را
گفتم میان عالم و عابد چہ فرق بود
تا اختیار کردی ازاں ایں فریق را
گفت او گلیم خویش بدر می برد ز موج
ویں جہد می کند کہ بگیرد غریق را

حضرت رحمۃ اللہ علیہ اس امر کا خاص خیال رکھتے تھے کہ طلباء اپنی متعلقہ کتابوں اور مفید دینی تصنیفات کے علاوہ غیر متعلق کتابوں کے مطالعہ میں مشغول نہ ہوں، میرے محلے کے ایک بزرگ نے بیان کیا کہ حضرت مولٰناؒ ایک دن احقر کے دادا مولوی بشیر احمد صاحب فریدی کے پاس تشریف لائے ہوئے تھے مسجدِ محلہ کے سامنے والے مکان کے تحتانی کمرے میں حضرتؒ کی نشست تھی، مسجد کے حجرے میں مظاہر نام کے ایک طالب علم مقیم تھے اُن کو مولٰنا کی موجودگی کا علم نہیں تھا اتفاق کی بات کہ اُس وقت وہ طالب علم (غالباً) فسانہ عجائب پڑھ رہے تھے اُن کے ساتھ چند اور طالب علم بھی تھے۔ کتاب پڑھتے پڑھتے جب اس شعر پر پہونچے ؎

قسمت کی خوبی دیکھئے ٹوٹی کہاں کمند
دو چار ہاتھ جبکہ لبِ بام رہ گیا

حضرت مولٰناؒ کے کان میں آواز پہونچ گئی، غصّے میں آکر نیچے سے آواز دی "مظاہر! ٹھیر جا۔ میں آتا ہوں۔ تو یہاں اِس لئے آیا ہے کہ فسانہ عجائب پڑھے گا۔" یہ سُننا تھا کہ طالب علم کا دم نکل گیا مع ساتھیوں کے مسجد کی دوسری جانب سے کود کر فرار ہو گیا۔ حضرت مولٰنا مسجد کی طرف چل پڑے تھے، دادا مرحوم نے خوشامد کر کے غصّے کو فرو کیا۔

تلامذہ

مدرسہ جامع مسجد امروہہ کے وہ پُرانے رجسٹر جن میں فارغ التحصیل طلباء کے اسماء معہ پتے درج تھے ضائع ہو گئے ورنہ آپ کے ہزاروں شاگردوں میں سے چند سو مشاہیر کا انتخاب بآسانی ہو سکتا۔ اب صرف چند کا اندراج کیا جاتا ہے، اِس فہرست میں اُن تلامذہ کا نام درج نہیں ہو گا جن کا نام پہلے آچکا ہے :-

(۱) استاذ القراء مولٰنا قاری ضیاء الدین صاحب مرحوم الٰہ آبادی۔

(۲) مولٰنا محمد فاروق صاحب انبیٹھوی سابق شیخ الحدیث جامعہ عباسیہ [illegible] دار العلوم دیوبند۔

(۳) مولٰنا عبد الرحمٰن صاحب سہارنپوری سابق رکن مجلس علماء بھوپال

(۴) مولٰنا غلام یحییٰ صاحب سابق صدر مدرس مدرسہ الٰہیات کانپور

(۵) مولٰنا خان زماں صاحب مدظلہ کانپور میں مقیم ہیں اور چند کتب صرف ونحو کے مؤلف ہیں۔

(۶) مولٰنا حکیم محمد اسحٰق صاحب کٹھوری مدظلہ۔

(۷) مولٰنا سید عبد الغفور صاحب سیوہاروی مرحوم۔

(۸) مولٰنا محمد اسمٰعیل صاحب سنبھلی مرحوم۔

(۹) مولٰنا ظہور علی صاحب بچھراؤنی مرحوم۔

(۱۰) مولٰنا قمر الدین صاحب سہسپوری مدظلہ۔

(۱۱) مولٰنا فضل حق صاحب سہسپوری مدظلہ۔

(۱۲) مولٰنا سید علی زینبی صاحب امروہی مرحوم۔

(۱۳) مولٰنا حافظ محمد یوسف صاحب انصاری مرحوم۔

مدرسہ اسلامیہ امروہہ آپ کے بعد

حضرت محدث امروہی مدرسہ امروہہ قائم کرنے والے بھی تھے صدر المدرسین وشیخ الحدیث بھی تھے اور عملاً مہتمم بھی، اگرچہ ضابطہ میں وقتاً فوقتاً کارِ اہتمام متعدد اشخاص کے سپرد ہوتا رہا۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے مجلس شوریٰ کے مضبوط نظام کے ماتحت بڑی خوبی اور حسن تدبیر کے ساتھ مدرسہ کو اعلیٰ منازل پر فائز کیا۔ اُن کا بڑا نصب العین اپنے استاد کی طرح یہی تھا کہ علوم نبوت کے ماہر زیادہ سے زیادہ پیدا ہوں اور اسلامی تہذیب ومعاشرۃ زیادہ سے زیادہ رواج پائے اور اس راستے سے ۱۸۵۷ء کے بعد کے پیدا شدہ زہر کا تریاق مہیا ہو جائے۔ بحمد اللہ وہ اس مقصد میں کامیاب ہو کر اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ اُن کی وفات کے بعد اُن ہی کے شاگرد مولٰنا حافظ عبد الرحمٰن صاحب صدیقی جو حضرت قاسم العلوم اور حضرت مولٰنا گنگوہی سے بھی مستفیض تھے، اس مدرسہ کے شیخ الحدیث وصدر المدرسین قرار پائے، اور حضرت حافظ صاحب کی وفات کے بعد آج اُن کے صاحبزادے مولٰنا عبد القدوس صاحب صدیقی صدر مدرس ہیں، اور مولٰنا اعجاز حسنین صاحب کے سپرد مدرسہ کی زمام اہتمام ہے۔

نواب وقار الملک مرحوم اور محدث امروہی

نواب وقار الملک نواب مشتاق حسین صاحب امروہی مرحوم بڑے وضعدار، خوش اخلاق اور مذہبی انسان تھے، تعلیمی تحریک میں وہ سرسید مرحوم کے رفقاء میں سے تھے لیکن جہاں تک عقائد کا تعلق ہے اُن کو سرسید سے بڑا بُعد تھا۔

نواب وقار الملک اہل علم اور اہل دین حضرات سے انتہائی عقیدتمندی سے پیش آتے تھے۔ حضرت محدث امروہی سے بھی اُن کو بہت ربط تھا۔ مدرسہ کی مجلس شوریٰ کے رکن تھے۔ لیکن نواب صاحب یہ چاہتے تھے کہ اس مدرسہ میں انگریزی تعلیم کا سلسلہ بھی عربی کے ساتھ ہی ساتھ جاری رہے۔ ایک مرتبہ انہوں نے اپنی یہ رائے مجلس شوریٰ میں پیش کی۔ حضرت محدث امروہی جس لائن پر مدرسہ کو چلا رہے تھے اور اُن کے استاد کا مدارس اسلامیہ کے قائم کرنے کا جو مقصود منشاء تھا، یہ بات اُس کے خلاف تھی اس لئے اس رائے کو قبول کرنے سے انکار فرما دیا۔ نواب وقار الملک نے اپنی رائے کو منوانا چاہا، وہ نہ مانی گئی تو انہوں نے فرمایا کہ میں مجلس شوریٰ سے کوئی تعلق نہیں رکھوں گا۔ اس پر حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی خودداری کا ثبوت دیتے ہوئے فرمایا کہ شاید نواب صاحب یہ خیال کرتے ہوں گے کہ اُن کے بغیر مدرسہ نہ چلے گا۔ میں نواب صاحب کی ذرہ برابر پرواہ نہ کروں گا۔ بعد کو نواب صاحب نے معافی مانگ لی تھی اور باہمی تعلقات بدستور خوشگوار رہے۔ اپنی جائیداد کا ایک حصہ نواب صاحب نے مدرسہ کے نام وقف کیا ہے۔

اولاد

حضرت محدث امروہی کی مختلف اوقات میں تین ازواج تھیں جن میں سے ایک کے بطن سے بڑی تمناؤں کے بعد ایک صاحبزادے حضرت مولٰنا سید محمد صاحب رضوی عرف بنے میاں مدظلہ۔ اور دو صاحبزادیاں تولد ہوئیں۔ صاحبزادہ موصوف نے قاری ضیاء الدین صاحب الٰہ آبادی سے تجوید سیکھی اور حضرت مولٰنا

حافظ عبدالرحمٰن صاحب رح سے سندِ فراغ حاصل کی۔ ان کے کئی صاحبزادے ہیں۔

انقلابِ زمانہ کا جہاں اکثر علمی خاندانوں پر اثر پڑا ہے، وہاں یہ خاندان بھی مستثنیٰ نہ رہ سکا۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے کئی نبیرگان ہیں۔ لیکن اُن میں سے کوئی بھی اپنے جد امجد میراثِ علمی کی تحصیل میں مشغول نہیں۔ لَعَلَّ اللّٰہَ یُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِکَ اَمْراً۔ خدا کرے کہ اس گھرانے میں پھر کوئی شہبازِ علم پیدا ہو۔

حضرت محدث امروہی رح کی جامعیت

مناسب سمجھتا ہوں کہ اِس عنوان پر بطور خود لکھنے کی بجائے دو اہلِ قلم حضرات کی تحریریں پیش کردوں۔

مؤلف تذکرۃ الکرام فرماتے ہیں:-

"معاصر علماء میں آپ کو درجۂ امتیاز حاصل تھا علمی اور فقہی مسائل میں علماء کو جب کوئی شبہات لاحق ہوتے حلِ مشکلات کی خاطر آپ ہی کی جانب رجوع کرتے آپکی رائے اور آپ کا فتویٰ علماء کے لئے سند ہوتا۔ جلسوں کے موقعوں پر جہاں بڑے بڑے ذی کمال اور فضلاء مجتمع ہوتے آپ کی شخصیت اُن سب میں نمایاں اور بلند و بالا شخصیت نظر آتی اور ان مواقع پر جب کبھی کسی دقیق علمی مسئلہ پر گفتگو فرماتے علماء ہمہ تن گوش ہو کر سنتے اور آپ کی دقتِ نظر اور تبحرِ علمی کا اعتراف کرتے خدائے تعالےٰ نے آپ کی ذات بابرکات میں وہ تمام اوصاف ودیعت کئے تھے جو ایک دینی مقتدا اور مذہبی و ملّی پیشوا کیلئے ضروری لازمی ہیں۔ صلاح و تقویٰ اور تبحرِ علمی کے ساتھ ساتھ دُنیوی معاملات میں بھی آپ نہایت صائب الرائے، صاحبِ فہم اور صاحبِ تدبیر تھے"

حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رح اپنے ایک تعزیتی مقالے میں تحریر فرماتے ہیں:-

"ہر شخص جس کو کچھ بھی تجربہ ہو یہ جانتا ہے کہ دُنیا میں بہت کم علماء ایسے ہوتے ہیں جن کو علمی شعبوں کی ہر ایک شاخ میں پُوری دستگاہ ہو مثلاً جن حضرات کو وعظ کہنے میں ملکہ ہوتا ہے وہ تدریس پر پُورے قادر نہیں ہوتے اور جو تدریس کے کام میں مشغول رہتے ہیں اُن کو کسی مجمع میں وعظ یا تقریر کرنا مشکل ہوتا ہے دینیات میں انہماک رکھنے والے اکثر معقول و فلسفہ سے ناآشنا ہوتے ہیں اور معقولات کے ماہرین کو علومِ دینیہ سے بے خبری ہوتی ہے لیکن قدرت نے اپنی فیاضی سے ہمارے مولائے ممدوح (محدث امروہی) میں یہ سب اوصاف اعلیٰ طور پر جمع کردیئے تھے۔ مولانا کی تقریر۔ تحریر۔ ذہانت۔ تبحر۔ اخلاق اور علوم عقلیہ و نقلیہ میں کامل دستگاہ ضرب المثل تھی اور سب سے زیادہ قابلِ قدر اور ممتاز کمال مولانا کا یہ تھا کہ حضرت قاسم العلوم والخیرات رح کے دقیق اور غامض علوم کو اُن ہی کے لب و لہجہ اور طرز ادا میں نہایت صفائی اور سلاست کے ساتھ بیان فرماتے تھے"

(القاسم ربیع الثانی ۱۳۳۰ہجری)

(بقیہ تنقید و تبصرہ ص ۴۸ کے بعد)

کرادیا گیا ہے۔ جب قواعد کا اجراء کسی بچے کو آگیا تو وہ بآسانی ترجمہ بھی کرسکتا ہے، چنانچہ ہر سبق کے بعد عربی سے اُردو، اور اُردو سے عربی بنانے کے لئے جملے بھی کافی تعداد میں دیئے گئے ہیں۔ کتاب کے اختتام تک پہنچتے پہنچتے طالب علم صرفی و نحوی قواعد سے بھی واقف ہوجاتا ہے، اُن کے اجراء پر بھی پُوری طرح قدرت حاصل کرلیتا ہے۔ اور بڑے بڑے جملوں کا ترجمہ (عربی سے اُردو اور اُردو سے عربی) کرنے کی صلاحیت بھی پیدا کرلیتا ہے۔ طلبائے مدارس عربیہ کے لئے تو یہ کتاب مفید ہے ہی لیکن جو لوگ عربی زبان سیکھنا چاہتے ہیں مگر باقاعدہ تحصیلِ علم کے لئے وقت نہیں نکال سکتے اُن کے لئے بھی یہ کتاب بہت ہی مفید ہے +

(عزیز احمد فیض آبادی)

تنقید وتبصرہ

"نصرۃ القرآن"!

مصنفہ مولوی عبدالحمید صاحب ارشد، کتابت و طباعت بہتر۔ ملنے کا پتہ:۔ "ڈاکٹر عبدالمجید صدیقی مجید یونائیٹیڈ کمپنی، بندر روڈ کراچی (۱)"

اس خواہش کے باوجود کہ پاکستان کے اندرونی معاملات میں ہمیں زیادہ بحث نہ کرنی چاہیئے۔ ہم بتقاضائے حقیقت خود کو یہ کہنے پر مجبور پاتے ہیں کہ پاکستان کی ہیئت حاکمہ کی بےدینی نے نہ صرف پرانے دینی فتنوں کو شاہباز بنکر آزادی کی فضاؤں میں اُڑنے اور پرواز کرنے کی کھلی چھٹی دی ہے، بلکہ کئی نئے فتنے، جو ابتک خواب عدم میں پڑے ہوئے اونگھ رہے تھے انگڑائیاں لیکر اُٹھ بیٹھے ہیں۔

غلام احمد صاحب پرویز اور اُنکے ساتھی اپنے دہلی کے زمانۂ قیام میں بھی دعوت الی القرآن کے نام پر اپنے عقائد واہیہ کی تبلیغ کرتے رہتے تھے، مگر یہ واقعہ ہے کہ اس وقت وہ ماحول کی ناسازگاری کے گلہ مند تھے اور اب اسلامی حکومت کے سایۂ حمایت میں انھیں وہ سب کچھ کہنے اور سب کچھ کرنے کی آزادی ہے جس کی اجازت شاید کسی غیر اسلامی حکومت میں بھی نہ مل سکے۔

اللہ اکبر! کتنی بڑی سنگدلی اور دیدہ دلیری ہے کہ مسلمان بنکر اسلام کی بنیادوں کو ہلا دینے کا پورا پورا ارادہ کرلیا گیا ہے، کھلے ہوئے دشمن سے محفوظ رہنا سہل ہے مگر خفیہ اور سازشی کارروائیوں کی تہہ تک پہونچنا، ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔

پاکستان میں انکار حدیث کے چرچے بڑھے تو ایک فرض شناس عالم اور مولوی عبدالحمید خاں صاحب ارشد کو دینی خدمت کی توفیق حاصل ہوئی، آپنے متعدد مقالات و مضامین میں ان خرافات کا جواب دیا جو ماہنامہ "طلوع اسلام" کے ہر پرچے میں سجا بنا کر پیش کی جاتی ہیں۔ اب مولوی صاحب نے یہ کتاب لکھی ہے اور اس میں کافی تفصیل کے ساتھ منکرین حدیث کے عقائد و افکار کی تردید کی ہے۔

اہل قرآن جنھیں حجیت حدیث سے انکار ہے صرف دو یا تین وقت کی نمازیں مانتے ہیں اس کے لئے کوئی خاص ہیئت ضروری نہیں سمجھتے، اقامت صلوٰۃ سے مراد مسلمانوں کا نظام اجتماعی لیتے ہیں، اہل استطاعت کے لئے روزہ ضروری نہیں سمجھتے اور فدیہ کو کافی سمجھتے ہیں، زکوٰۃ کی کوئی معین مقدار ان کے نزدیک نہیں ہے۔ حج کو صرف فرض کفایہ سمجھتے ہیں، اس کی حیثیت ان کی نظر میں صرف ایک دنیاوی کانفرنس کی ہے۔ غیر حجاج کے لئے عید اضحی میں قربانی کے قائل نہیں۔ احادیث کا سارا ذخیرہ ان کے نزدیک ظنی ہے اور اور ظن کی پیروی قرآن کی رو سے منع ہے۔ انہوں نے حدیث کو حجیت اور اسے قرآنی دستور العمل کی تشریحی اور تفصیلی صورت کی حیثیت سے ہٹاکر صرف تاریخ کا مقام دیا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ عقیدہ اس لحاظ سے سخت مہلک ہے، کہ قرآن مجید میں صرف اہم اصولی اور کلی تعلیمات ہیں جن کی تفصیل و تشریح درست طریق پر حدیث ہی سے ہوتی ہے وما اتاکم الرسول فخذوہ وما نہاکم عنہ فانتھوا کی نص قرآنی سے قرآنی تعلیمات کے ساتھ رسول کے قول و عمل کی کتنی بڑی اہمیت قائم ہوتی ہے۔ اگر حدیث کے ذخیرے کو سامنے سے ہٹا دیا جائے تو تعلیمات قرآن میں بیجا تاویلات اور موشگافیوں کے دروازے کھل جائیں گے۔

مولوی صاحب نے اپنی اس کتاب میں اُن تمام عقائد واہیہ اور افکار طاغیہ کی مفصلاً تردید اور ہر ہر جزء کو سامنے رکھ کر مضبوط استدلال اور برہان کے ساتھ اس پر گفتگو کی ہے، قربانی اور نماز کے متعلق اس فرقہ نے جس قدر بدعقیدگی پھیلانی چاہی تھی مولوی صاحب نے پوری کامیابی کے ساتھ اس کا تعاقب کیا ہے۔

مولوی صاحب کی یہ تصنیفی خدمت قابلِ تحسین اور اس لحاظ سے کافی اہمیت رکھتی ہے کہ ابھی منکرینِ حدیث کے تردیدی لٹریچر کی کمی ہے یہ کتاب اپنے اثرات کے لحاظ سے انشاء اللہ کامیاب ہوگی۔

کتاب کا لہجہ اگر صرف تحقیقی اور تردیدی ہوتا تو بہت اچھا تھا۔ ناظرؔ زبان وبیان اور ذیلی عنوانات کے ہلکے پن سے اسکی شائستگی میں کافی فرق محسوس ہوتا ہے، قدم قدم پر اس کا احساس ہوتا ہے کہ مصنف متانت وسنجیدگی کے ساتھ گفتگو کرنے کی بجائے غصہ سے کام لے رہے ہیں۔ مصنف نے جمع قرآن کے ساتھ تدوین حدیث پر بھی بحث کی ہے لیکن حقیقت واضح کرنے کے لئے کہ اگر صحیح احادیث کو غیر معتبر مانا جائے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی، اور اُن کی ساری دعوت ہی غیر معتبر ہو جاتی ہے۔ مصنف اگر احادیث کے دینی مقام، اس کی تاریخی حقیقت اُن کی ترتیب روایت کے شرائط واصول پر پوری بحث فرما دیتے، تو منکرینِ حدیث کے پھیلائے ہوئے فتنہ کی بنیادوں پر کاری ضرب پڑ جاتی۔

(سید محمد ازہر شاہ قیصر)

قصص النبیین للاطفال!

تالیف مولانا سید ابوالحسن علی ندوی۔ حصہ اول کی ضخامت ۶۳۔ اور حصہ دوم کی ۵۹ صفحات، کتابت وطباعت بہترین، مطبوعہ مصر۔ قیمت حصہ اول ۱۰/ اور حصہ دوم بھی ۱۰/ ملنے کا پتہ۔ ندوۃ العلماء لکھنؤ

چھوٹے چھوٹے بچوں کو عموماً کہانیوں سے بہت دلچسپی ہوتی ہے۔ ہر ملک کا دستور ہے کہ رات کو گھر کی بڑی بوڑھیاں بچوں کو طرح طرح کی کہانیاں سناتی ہیں، کوئی کہانی سبز پری کی ہے تو کوئی لال پری کی، کوئی راجہ ڈھولا کی ہے تو کوئی گل بکاؤلی کی۔ مگر بچے ہیں کہ نانی اماں سے چمٹے ہوئے کہانی کا مزہ لے رہے ہیں۔ بچوں کی اس دلچسپی سے فائدہ اُٹھانا ہر کس وناکس کا کام نہیں ہے، ایک ماہر نفسیات ہی اس دلچسپی کو قائم رکھتے ہوئے اور اس کا پورا لحاظ رکھتے ہوئے انھیں ناکارہ بچوں سے جو جھوٹی کہانیاں سن سن کر اوہام پرستی کی طرف مائل ہو چکے ہیں، بڑے سے بڑا کام لے سکتا ہے۔

مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوۃ العلماء کے فارغ التحصیل ہیں اور ندوہ سے فراغت کے بعد دارالعلوم دیوبند میں بھی دورۂ حدیث پڑھا موصوف نے پیشِ نظر کتاب میں بچوں کی نفسیات کا لحاظ رکھتے ہوئے کلام پاک کے سچے اور مستند قصے عربی زبان میں لکھے ہیں۔ مگر قصہ لکھنے کا طرز ایسا عجیب ہے کہ پڑھنے والا پڑھتا تو ہے قصہ سے حظ اٹھانے کے لئے، مگر جب قصہ ختم کرتا ہے تو اُسے بیّن طور پر محسوس ہوتا ہے کہ عربی زبان کے وہ سب لغات جو قصہ میں آئے ہیں اُسے یاد ہو گئے ہیں۔

کہانیوں کے لکھنے میں اس کا خیال رکھا گیا ہے کہ پہلی سطر میں جو لغات آئے ہیں دوسری سطر میں بھی اُن لغات کی تکرار ہو جائے اور کچھ نئے لغات بھی آجائیں۔ پھر تیسری سطر میں وہ لغات بھی آجائیں جو پہلی اور دوسری سطر میں آئے ہیں اور کچھ مزید نئے لغات بھی شامل ہو جائیں اسی طرز پر پوری کتاب لکھی گئی ہے۔ پہلے حصہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت یوسف علیہ السلام کے قصے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قصہ کو چھوٹے چھوٹے سولہ سبقوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے اور حضرت یوسف علیہ السلام کے قصہ کو ۲۵ سبقوں میں۔ اور حصہ دوم میں حضرت نوح علیہ السلام، حضرت ہود علیہ السلام اور حضرت صالح علیہ السلام کے قصوں کو لکھا گیا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کے قصہ کو چھوٹے چھوٹے ۲۲ سبقوں میں اور حضرت ہود علیہ السلام کے قصہ کو گیارہ سبقوں میں اور حضرت صالح علیہ السلام کو ۱۳ سبقوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ چھوٹے چھوٹے بچے اس کتاب کو بہت شوق ورغبت سے پڑھتے ہیں۔ (عزیز احمد فیض آبادی)

معلّم الانشاء!

مصنفہ مولانا عبدالماجد صاحب ندوی، سائز ۲۰×۳۰/۱۶ کتابت وطباعت عمدہ۔ صفحات ۱۸۰ قیمت عہ ملنے کا پتہ ۔۔۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ ۔۔۔

صرف ونحو کے قواعد اور خصوصاً عربی زبان کے، اس طرح بچوں کو کبھی نہیں یاد ہوتے کہ انھیں زبانی رٹا دیا جائے۔ سمجھانے اور یاد کرانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ جو قاعدہ بھی پڑھایا جائے ساتھ ہی ساتھ اس کا اجراء بھی ہوتا رہے۔ معلم الانشاء میں اس کی پوری پابندی کی گئی ہے کہ ہر صرفی ونحوی مسئلہ کو سلیس سے سلیس زبان میں سمجھا کر تمرین ومشق کے ذریعہ اس قاعدہ کا اجراء بھی

(بقیہ صفحہ ۴۹ کالم ۲ پر)